

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. 9225928

Name of Book

معمودیش بخت

Name of Author

رتن لال

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_188642

9225928

LIBRARY
UNIVERSAL

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۹۲۲۵۹۷۸ Accession No. ۱۵۱۸۷

Author

م - ۱ ۱۵۱۸۷

Title

سلم دانش هجرت

This book should be returned on or before the date
last marked below.

مسلم دیش بھکت

لیکھک
رتن لال نسل فیروز آبادی

۱۵۱۸۷

چھپوانے والے -
سکرٹری ، ہندوستانی پبلیکیشن سوسائٹی
۴۸ ، بالی کا باغ الدہ آباد

پہلی بار ۱۹۴۹
قیمت ایک روپیہ بارہ آنے

چھاپنے والے -
حافظ محمد سلیم
سلیمی برقی پریس
الہ آباد

کہاں کیا ؟

صفحہ	مضمون	نمبر
	دیکھئے	۱
۱ ..	شاہ ولی اللہ	۲
۱۳ ..	شاہ عبد العزیز	۳
۲۱ ..	شاہ محمد اسحاق	۴
۲۹ ..	حاجی امداد اللہ صاحب	۵
۴۱ ..	مولانا محمد قاسم	۶
۵۲ ..	حاجی رشید احمد گنگوہی	۷
۶۴ ..	مولانا محمود الحسن	۸
۸۲ ..	مولانا عبید اللہ سندھی	۹
۹۵ ..	حاجی فضل واحد	۱۰
۱۰۵ ..	مولانا فضل حق خیر آبادی	۱۱
۱۱۴ ..	مولوی احمد شاہ	۱۲
۱۲۴ ..	مولانا برکت اللہ بھوپالی	۱۳
۱۳۹ ..	مولانا مظہر الحق	۱۴
۱۵۱ ..	مولانا محمد میاں منصور انصاری	۱۵
۱۶۲ ..	برگیدہ محمد عثمان	۱۶

دیکھئے

کتاب کا نام دیکھ کر جب میں اٹکا تو ہو سکتا ہی، میری طرح اد بھی
 آئیں۔ دیش بھگت کے پیچھے ہندو مسلم کا پھیلنا کیوں۔ دیش بھگت
 تو سچ ہندو مسلم پنے سے بہت اونچا ہوتا ہی۔ دیش بھگت
 ہونے کے لئے ایشور بھگت ہونا ضروری ہی اور ایشور بھگت ہندو
 سلمان میں بھید کیوں کرے گا، اور وہ خود اس بھید کی کیچڑ میں
 کیوں پھلے گا۔ ناستک یا منکر سمجھے جانے والے آدمی بھی سچے دیش
 بھگت ہو سکتے ہیں۔ یہ ایسے آدمی تو ایشور بھگت سے ایک ہاتھ
 بڑھ کر ایماندار ہوتے ہیں۔ ہم ناستک دو طرح کے مانتے ہیں۔ ایک
 کو ہم ناستک ناستک اور دوسرے کو ناستک سمجھتے ہیں۔ ناستک ناستک
 تو ہم اُسے مانتے ہیں جو سچ سچ نہ ایشور کو مانتا ہی، نہ خدا کا قائل
 ہی، نہ پر لوک میں دشواس رکھتا ہی اور نہ انسانیت کا ہی پجاری
 ہوتا ہی۔ وہ تو دیش بھگت ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں، کسی مطلب
 کے لئے دیش بھگت کا نام لکھ سکتا ہی۔ ناستک ہم اُسے

کہتے ہیں جو دکھانے کے لئے نہ مسجد سے غرض رکھتا ہے نہ مسجد
 مطلب ۔ اُسے نہ نماز سے کچھ لینا نہ پوجا کو کچھ دینا۔ نہ قرآن کی
 تلاوت نہ دید کا پاٹھ۔ وہ تو سر سے پاؤں تک انسانیت میں ڈوبا
 ہوا ہوتا ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ اُسکے اندر کا خدا اُس میں جاگ
 گیا ہوتا ہے۔ دوشبدوں میں بھیتر بھیتر جس کے رام وہ ہرنا شک
 اور جس کے باہر رام وہ لوگوں کی نظروں میں آشک۔ پر جس کے
 بھیتر بھی رام اور باہر بھی رام اُسے ہم کہتے ہیں آشک آشک۔
 جن دیش بھگتوں کی زندگی آپ کو اس کتاب میں ملے گی، وہ بھیتر
 بھی خدا پرست تھے اور باہر بھی۔ یعنی آشک آشک تھے۔ انہیں
 غلامی برداشت نہ تھی۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ ہندستان کے اکیلے
 مسلمان کی آزادی اتنی ہی بے معنی بات ہے، جیسے کسی آدمی
 کے آدھے جسم کی آزادی۔ اسلئے اُنکی کوششیں کسی ایک فرقہ
 کے لئے نہ تھیں اور نہ ہو سکتی تھیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اُنھوں نے اپنی
 آسانی کے خیال سے ہندستان کی آزادی کے لئے کسی ایک فرقے کو
 ہی اوزار یا ہتھیار بنایا ہو۔ ہاں، تو پھر ایسے دیش بھگتوں کے
 لئے مسلم یا ہندو نام سے پکارنا کا نوز کو اچھا نہیں لگتا۔ پر ہندستان
 کی اب تک کی ہوا اور آج تک کی ہوا مجبور کرتی ہے کہ کتاب کا نام
 مسلم دیش بھگت ہی رہے۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ اس میں اُن
 دیش بھگتوں کا حال ہے، جنھوں نے مسلمان گھرانے میں جنم لیا تھا،
 نہ اس وجہ سے کہ وہ دین اسلام کے قائل تھے بلکہ اس وجہ سے کہ
 مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد یہ جانتی ہی نہیں کہ وہ انہوں میں سے

کتنوں کو دیش بھگتی کی دیدی پر قربان کر چکی ہے امداد ہندوؤں کو
 ہی یہ پتہ ہو کہ مسلمانوں میں کیسے کیسے ہونہار، جمان اور کیسے
 کیسے قابلِ وجود دیش بھگتی کی بل دیدی پر پٹھار ہو چکے ہیں۔
 اس کتاب کو پڑھ کر ہندو اور مسلمان دونوں ہی ایسا محسوس
 کریں گے، 'ماؤدہ ہندستان کی تاریخ کو ایک نئے اور انوکھے روپ
 میں پڑھ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے، اس کتاب کو پڑھتے پڑھتے
 مسلمانوں کی چھاتیاں پھول اٹھیں اور ہندوؤں کے دل سے مسلمانوں
 کے لئے ادھے پن سے بھرا ہوا غبار آکھوں کی راہ پانی بن کر
 نکل جائے۔

ہمارا دل یہی کہتا ہے کہ کتاب ہندو مسلمانوں کو پاس لانے
 میں بڑی مدد کرے گی اور دونوں کے دل دھوکہ ایک دوسرے
 پر بھروسہ پیدا کرنے میں بڑی مدد ثابت ہوگی۔ یہ کتاب سننے
 کے لئے تو ضروری ہے ہی، پر ہمیشہ ضروری بنے رہنے کی قابلیت
 رکھتی ہے۔ دیش بھگتوں کی زندگیاں امر ہوا کرتی ہیں۔

پڑھئے اور پھر پڑھئے، امداد سمجھ لیجئے کہ بات دیسی نہیں
 تھی جیسی آپ اب تک سمجھے ہوئے تھے۔ غلامی کے کانٹے
 کی دل میں ایک سی چھین ہوتی ہے۔ اُس چھین کو دور
 کرنے کی ایک سی کوشش ہوتی ہے اور آزادی کے امرت
 کی سٹھاس ہر گھلے کو ایک سی ہی لگا کرتی ہے۔

اب آپ آزادی کے پھرتے ہیں۔ اس جانکاری

میں آپ کو لطف ہی آئے گا کہ اس چھپر کے اوپر تک
پہنچنے میں کن کن کے ہاتھ لگے تھے۔

بھگوان دین

نئی دہلی
۵ - ۱ - ۴۹ ع



حضرت شاہ ولی اللہ

ہمارے ملک میں ہندو اور مسلمانوں کے آپسی من مٹاؤ سے ملک کے جہاں اور بہت سے نقصان ہوئے وہاں ایک یہ بھی ہوا کہ بہت سے ایسے سنت مہاتما اور ولی اللہ جتنوں نے بنا کسی بھید بھاؤ کے پورے ہندستان کو ادخا اٹھانے اور اُسے ترقی دینے کی کوششیں کیں، صرف اس لئے بھلا دے گئے کہ وہ اس یا اُس مذہب کے تھے۔ بہت سے ایسے لوگ جن کی تباہی ہوئی راہ پر چل کر سارا دیش آگے بڑھ سکتا تھا بہت سے بہت ایک مذہبی لیڈر بن کر رہ گئے۔

اٹھارویں صدی کے مسلمان دعویش شاہ ولی اللہ بھی ہمارے ملک کی ایک ایسی ہی زبردست ہستی تھے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے زمانے کے گرتے ہوئے اخلاق اور بگڑتے ہوئے چال چلن کو ہی ادخا اٹھانے کی کوشش کی، بلکہ اُس زمانے کی راج نیت میں بھی بہت بڑا حصہ لیا۔ برہمنی قوموں کے بڑھتے ہوئے خوفناک پنجوں سے ہندستان کو بچانے کے لئے وہ زندگی بھر لڑتے رہے اور اپنے فارٹوں، بیٹوں، ماتیتوں اور ہزاروں شاگردوں کے دل میں ایسی آگ چھوڑ گئے کہ انھوں نے مرجانا پسند کیا، پر ہندستان کی خلائی کو چپ چاپ برداشت نہیں کیا۔ آئیے، آج جبکہ ہمارے ملک کی حیدر آباد سے سوئی ہوئی قسمت کچھ کریش لینے لگی ہے اور آسمان پر امیدوں کے تاروں کی جھک کچھ کچھ نظر آنے لگی ہے ہم اپنے اس بزرگ کی پاک زندگی پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں۔

شاہ صاحب کی پیدائش

سترہویں صدی کے اخیر کے اس انقلابی دور میں، جبکہ اوزنگ زیب کی حکومت کے خلاف جگہ جگہ بغاوتیں ہو رہی تھیں، دہلی کے ایک مشہور درویش گھرانے میں چار شوال سن گیارہ سو چودہ ہجری یعنی سنہ ۱۷۰۲ء کے قریب بڑھ کے دن شاہ ولی اللہ کا جنم ہوا۔ آپ کے پتا کا نام شاہ عبدالرحیم تھا۔ شاہ عبدالرحیم بہت بڑے عالم صوفی تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شاہی دربار میں مولویوں کا بول بالا تھا۔ شاہ عبدالرحیم اگر چاہتے تو شاہی دربار میں رتبہ حاصل کر سکتے تھے۔ پر انھوں نے اُسے اپنی فقیہ کی شان کے خلاف سمجھا اور ہمیشہ شاہی مدد کے سایہ سے بھی بچتے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے جب بھی ضرورت سمجھی بڑھو کر بادشاہ کے برے کاموں کو بُرا کہا اور حکومت کی بھولوں کو صاف صاف دکھایا۔

شاہ عبدالرحیم اوزنگ زیب کی بھی نیک چلنی، پرہیزگاری اور سادہ زندگی کے قائل تھے، پر اس بات سے انھیں بڑی تکلیف ہوتی تھی کہ کچھ کٹر مولویوں کے کہنے پر حکومت کی طرف سے ہندوؤں اور شیعوں کو صرف اس لئے ستایا جاتا تھا کہ دے ہندو یا شیعہ ہیں۔ ان کے خیال سے یہ بات اسلام کی نصیحتوں اور اسلامی قانون کے خلاف تھی۔ ساتھ ہی انھیں ڈر تھا کہ اس طرح حکومت کے پائے کمزور پڑ جا دیں گے، ملک میں بھگڑے کھڑے ہو جا دیں گے اور ہندستان کی ترقی رک جائے گی۔ اوزنگ زیب کی حکومت کے اس دور میں جبکہ مغل سلطنت کا سورج پورے چڑھاؤ پر تھا شاہ عبدالرحیم صاحب نے آنے والے خطروں کو صحیح صحیح پہچان لیا تھا۔

شاہ ولی اللہ کو مذہبی تعصب سے ادھر اٹھ کر سوچنے اور سمجھنے کی عادت اپنے پتا سے ملی۔ پانچ سال کی عمر میں وہ اپنے پتا کے مکتب میں بیٹھے، سات سال کی عمر تک قرآن شریف پورا کیا۔ اس کے بعد تین سال تک وہ عربی کی مشہور کتاب ”شرح ملا جامی“ پڑھتے رہے، اور پھر چودہ سال کی عمر تک اسلامی فلسفے کی اور کتابوں کو گہرائی سے پڑھا۔ چودہ سال کی عمر میں شاہ ولی اللہ کی شادی ہو گئی، ایک سال بعد اپنے پتا کی شاگردی میں وہ مسلک، یعنی یوگ ابھیاس اور دل کی صفائی کی کوششوں میں لگ گئے۔ ابھی دو سال ہی بیتے تھے کہ شاہ عبد الرحیم چل بسے۔ اس چھوٹی سی عمر میں ہی اپنے پتا کی گدی سنبھال کر شاہ ولی اللہ نے اپنے مدرسے میں پڑھانا شروع کر دیا۔

اس کے بعد شاہ ولی اللہ نے اپنے ملک کی حالت پر نظر ڈالی انہوں نے دیکھا کہ کچھ سال پہلے اُن کے پتا نے حکومت کے رنگ ڈھنگ کو دیکھ کر جو ہونہار بنائی تھی وہ سچ ثابت ہو رہی تھی۔ ملک میں جگہ جگہ بڑے کھڑے ہو گئے تھے۔ ہندستان کی وہ ایکتا جسے اکبر بڑی کوششوں سے بنا پایا تھا خطرے میں تھی۔ اورنگ زیب دنیا سے سدھار چکا تھا۔ اس کے اٹھتے ہی بہت سی آزاد حکومتیں صوبے صوبے میں بن گئی تھیں۔ شاہ ولی اللہ نے یہ بھی دیکھا کہ ملک کے ان آپسی جھگڑوں سے انگریز اور فرانسیسی اپنا مطلب مادھنے کی کوششیں کر رہے تھے اور کھلے عام اس ملک کی حکومت میں حصہ لینے لگے تھے۔

حالت بہت نازک تھی، ملک کا ہر سردار، راجا یا نواب اپنی ہی بڑھتی
کی فکر میں تھا۔ ملک کی کسی کو بھی پرواہ نہیں تھی اپنے تھوڑے سے
فائدہ کے لئے اُن میں سے ہر ایک کوئی بھی کام کرنے کے لئے تیار تھا۔
راجدھانی دہلی میں دن رات سازشیں چلتی رہتی تھیں اور قتل پھانسیوں
اور لمبی سزاؤں کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔

شاہ ولی اللہ کچھ دنوں اس حالت پر دچار کرتے رہے، اس کے بعد
دوسرے ملکوں کا حال جاننے کے لئے وہ حج کے واسطے مکہ گئے، وہاں
دو سال رہے۔ زمانے کی حالت پر بڑے بڑے عالموں سے بحث کی
زمانے کے مشہور عالم شیخ ابوطاہر سے ایک عرصے تک تعلیم حاصل کی۔
بعد کو ہندستان واپس آ گئے۔

یہاں آکر اُنھوں نے اپنے خیال پھیلانے شروع کئے، اُنکی رائے میں
اُس زمانہ کی ان تمام برائیوں کی جڑ میں دو خاص باتیں تھیں۔

(۱) یہ کہ ہندو یا مسلمان دونوں مذہب کے لوگوں میں وہ سچا
مذہبی جذبہ نہ رہ گیا تھا جو انسان کو انسان بنائے رکھتا ہے، اُسے اُن
میں ایک طرح کی لاندہبی یا ناستکنا پیدا ہو گئی تھی جس سے وہ اپنے یا
اپنے گھرانے کے نجی فائدے نقصان کو ہی دیکھ سکتے تھے۔ اور سماج یا ملک
کا بڑے سے بڑا فائدہ اپنے نجی فائدے کے اوپر قربان کر سکتے تھے۔

(۲) یہ کہ اوپر کے امیر امرا، رئیسوں اور سرداروں نے سچے کے
لوگوں پر اپنی عیش آرام کی زندگی کا اتنا بڑا بوجھ لا دیا تھا کہ وہ
یعنی دیس کے عام لوگ حیوانوں کی سی زندگی بتانے پر مجبور
ہو گئے تھے۔ شاہ صاحب اپنی ایک کتاب ”حجۃ المبالغہ“

میں لکھتے ہیں۔
 ”اگر کسی قوم میں دھن دولت کی لگاتار ترقی جاری رہے تو اُس کی صنعت و حرفت (کلا کوئل) اعلیٰ کمال پر پہنچ جاتی ہو۔ اسکے بعد اگر حکومت کرنے والی جماعت آرام و آسائش اور زینت و تفاخر (سج دھج اور گھمنڈ) کی زندگی کو اپنا معمول بنائے تو اُسکا بوجھ قوم کے کاریگر طبقات (شرینیوں) پر اتنا بڑھ جاویگا کہ سوسائٹی کا بڑا حصہ انوں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاویگا۔ انسانیت کے اجتماعی اخلاق (سماجی پیداچار) اُس وقت برباد ہو جاتے ہیں، جب کسی جبر سے اُنکو اقتصاد (مالی) تنگی پر مجبور کر دیا جائے، اُس وقت لوگ گدھوں اور بلیوں کی طرح صرف روٹی کمانے کے لئے کام کریں گے اور جب انسانیت پر ایسی مصیبت آتی ہو تو خدا انسانیت کو اس مصیبت سے نجات (بچھکارا) دلانے کے لئے کوئی راستہ ضرور الہام کرتا (بھاتا) ہو یعنی ضروری ہے کہ قدرت الہیہ (ایسٹوئیٹکٹی) انقلاب کے سامان پیدا کر کے قوم کے سر سے اس بجا حکومت کا بوجھ اُتار دے۔“

ان جملوں کو پڑھتے وقت یہ یاد رکھنا چاہئے کہ تب تک یورپ میں نہ کابل مارکس پیدا ہوا تھا اور نہ سوشلزم (سماج واد) کی کوئی تحریک چلی تھی۔

شاہ ولی اللہ چاہتے تھے کہ عام لوگ آگے بڑھیں اور ہندستان میں ایک جمہوری (جتائی) حکومت قائم کی جائے۔ ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ۔ ”سلطنت کا خیرازہ بکھر چکا ہے (جوڑ ڈھیلے ہو چکے ہیں) اور مغلیہ سلطنت میں قیصر و کسری (ایران درم

شاہ ولی اسد

ہمراٹوں کی سی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس لئے مصلحت خداوندی (ارشاد)
(اچھا) یہی ہے کہ اس نظام کو سرے سے توڑ دیا جائے۔

قرآن شریف کا ترجمہ

عام لوگوں میں سچی مذہبی زندگی لانے کے لئے شاہ صاحب نے قرآن شریف
ترجمہ کرنا شروع کیا۔ اُس زمانے میں پڑھے لکھے مسلمان عربی کی نسبت
بسی بہت زیادہ جانتے تھے۔ دوسرے مذہبوں کے لوگ بھی فارسی
مت پڑھتے تھے۔ شاہ صاحب چاہتے تھے کہ فارسی ترجمے کے ذریعے قرآن
اصلی سندیش عام لوگوں تک پہنچا دیں۔

جب سے قرآن شریف اس دنیا کو ملا تب سے یہ پہلا موقع تھا کہ اُس کا
عجمہ ایک دوسری زبان میں کیا جا رہا تھا۔ یہ کام ایک ایسا انقلابی کام
تھا جس نے مسلمانوں میں ایک ہل چل پیدا کر دی۔ بہت سے ملاؤں نے
اس کی مخالفت کی، لیکن شاہ صاحب نے کوئی پرواہ نہیں کی اور اپنے
سے میں برابر اپنے اسی ترجمے کو پڑھاتے رہے۔ اپنے ترجمے میں انہوں
نے قرآن کی آیتوں کی تشریح (دیا لکھیا) کرتے ہوئے بھی پُرانے ملاؤں کی
لے کے خلاف بڑے بڑے انقلابی اور نئے معنی کئے۔

قتل کی سازش

حکومت کو یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ شاہ ولی اسد ملک میں
سیاسی انقلاب کرانا چاہتے ہیں۔ ایک دن شام کو جب شاہ
صاحب اپنے تھوڑے سے شاگردوں کے ساتھ دلی کی مسجد فتحپوری میں

ناز پڑھ رہے تھے کچھ لوگوں نے آکر انہیں گھیر لیا۔ شاہ صاحب نے دوسرے دروازے سے نکل جانا چاہا۔ جب اُس دروازے کو بھی گھل پھل پایا تو انہوں نے پوچھا کہ آخر آپ لوگ کیوں میرے خون کے پیاسے ہیں جو اب ملا کہ ہم مولیٰ ہیں تم نے یہ ترجمہ لکھ کر ہماری روٹی اور عزت دونوں پر اور خود قرآن پر حملہ کیا ہے۔ شاہ صاحب نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی، جب وہ نہ مانے تو اُن کے شاگردوں نے بھی تلواریں کھینچ لیں۔ کسی طرح شاہ صاحب کی جان بچ گئی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ حملہ حکومت کی سازش سے ہوا تھا، کیونکہ شاہ صاحب کی نصیحتوں اور اُپدیشوں میں حکومت کو اپنی موت نظر آنے لگی تھی۔

شاہ صاحب کی اور کتابیں

اس ترجمے کے بعد شاہ ولی اللہ نے قریب تیس کتابیں اور لکھیں جن میں انہوں نے اپنے انقلابی پروگرام کو بیان کیا ہے۔ ان کتابوں سے شاہ صاحب کے سیاسی خیالوں پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ بہت بار تو یہ دیکھ کر دنگ رہ جانا پڑتا ہے کہ آج جن اُکھنوں میں ہمارا ملک پھنسا ہوا ہے اُن پر ہمارے اس دور تک دیکھنے والے درویش نے کتنی قابلیت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

شاہ صاحب کے تین خاص اصول

شاہ صاحب کی کتابوں سے اُنکے تین خاص اصول کا پتہ چلتا ہے۔

پہلا یہ کہ وہ ہندستان کو ایشیا کا ایک طاقتور ملک دیکھنا چاہتے تھے۔ اُن کی رائے میں یہ بھی ہو سکتا تھا، جب یہ پورا ملک کسی ایک حکومت کے آدھین ہو۔ اُنھوں نے اپنی کتاب ”ہندوستان بازغہ“ میں لکھا ہے کہ ملک میں چھوٹے چھوٹے خود مختار راج بھلے ہی ہوں، لیکن اُن کا ایک فیڈریشن ہونا چاہئے، جس میں کسی بھی مسئلے پر پورے ہندستان کا فائدہ نقصان نگاہ میں رکھ کر غور کیا جاسکے۔ فیڈریشن کے لئے اُنھوں نے ”ارتفاق“ لفظ استعمال کیا ہے۔ انھیں اکبر کے زمانہ کا ہندستان اچھا لگتا تھا، لیکن ان کا منشا اکبری سامراج کو پھر سے زندہ کرنا نہیں تھا۔ وہ سارے ملک میں ایک ایسی جمہوری یعنی جنتا کی حکومت چاہتے تھے جس میں چھوٹے بڑے، غریب امیر سب برابر کا حصہ لے سکیں۔

دوسرے وہ ہندستان بھر میں ہندو مسلمان اور سب کیلئے ایک ہی قسم کا قانون چاہتے تھے جس کی پابندی ہر مذہب کے لوگ کر سکیں۔ اُنھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ — ”اس کو نکاح کی مثال سے سمجھنا آسان ہوگا۔ نکاح کی رسم کا مطلب صرف یہ ہے کہ سماج کو ایک عورت اور ایک مرد کے بیچ شوہر اور بیوی کے سمبندھ پیدا ہو جانے کا پتہ چل جائے، پھر چاہے یہ کام باجے بجا کر، گیت، گاکر، آگ کے سامنے کیا جائے یا کسی قاضی کے سامنے رسم پوری کی جائے، نکاح کا مقصد دونوں ہی طرح سے پورا ہو جاتا ہے۔ راج کو صرف اس کی پابندی سے مطلب ہے، دیکھو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔“

تیسری بات جس پر اُنھوں نے سب سے زیادہ زور دیا ہے یہ تھی

کہ سب طرح کے مزدور پیشہ اور کاریگر لوگوں کو اُن کے صحیح حق دلائے جاویں اور ان پر کم سے کم بوجھ رکھا جائے۔ اسی مسئلے پر اُنھوں نے سب سے زیادہ لکھا ہے اور منغل سلطنت کے گرنے کی خاص وجہ یہی بتائی ہے۔ وہ ایک ایسی حکمرانیت چاہتے تھے جس میں کسی بھی آدمی کو اپنی زندگی کی ضرورتوں کے لئے ترسنا نہ پڑے۔ اُنھوں نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے۔ "الغرض انسانوں کی اجتماعی (ملی ہوئی) زندگی کے لئے اقتصادی توازن (آرتھک یعنی مالی برابری) ایک ضروری بات ہے۔ ہر انسانی جماعت کو ایک ایسے اقتصادی نظام (آرتھک سسٹم) کی ضرورت ہوتی ہے جو لوگوں کی زندگی کی سب ضرورتوں کا کنٹریول (پورا کرنے والا) ہو۔ جب لوگوں کو اپنی اقتصادی (مالی) ضرورتوں سے اطمینان نصیب ہوتا ہے تو پھر کہیں وہ اپنے خالی وقت میں، جو اُنکے پاس کسب معاش (روزی کمانے) کے بعد بچ رہتا ہے، زندگی کے اُن شعبوں (کاموں) کی ترقی اور تہذیب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں (دھیان دیتے ہیں) جو انسانیت کے اصل جوہر ہیں۔"

شاہ صاحب ان معاملوں میں کہتے سوشلسٹ یعنی ساموادی تھے کمیونٹ مینی فیسٹو، لکھنے سے یہ قریب سو برس پہلے کی بات ہے۔

عمل کے میدان میں

اپنی کتابوں اور تقریروں سے پرچار کرنے کے بعد اپنے ان خیالوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ۵ مئی ۱۹۳۷ء کو اُنھوں نے باقاعدہ ایک جماعت بنائی جس کا مقصد ہندوستان میں

ایک سیاسی انقلاب کرنا تھا۔ اس جماعت کے چار اصول تھے (۱) خدا پرستی یعنی البشور کی پوجا (۲) انصاف (۳) تربیت نفس یعنی اپنے چہرے کو ٹھیک کرنا اور (۴) ضبط نفس یعنی سنیم۔

اس جماعت کا نام ”جمعیت مرکزیہ“ یعنی ”سنٹرل کمیٹی“ رکھا گیا اور ملک کے سب حصوں میں اس کی بہت سی شاخیں قائم کی گئیں۔ ان شاخوں میں نجیب آباد کا مدرسہ، بریلی میں شاہ علم اُمد کا اکیڈم اور سندھ کے شہر ٹنڈی میں ملا محمد معین کا مدرسہ خاص تھے۔

ان شاخوں کے ذریعے سارے ملک میں شاہ ولی اللہ کے خیالوں کا پرچار کیا گیا۔ شاہ صاحب کے خاص شاگردوں میں مولانا محمد حسین نقوی، مولوی نور اللہ برہانوی اور مولانا محمد امین کشمیری نے پرچار کا کام اپنے اوپر لیا، اور امیروں، غریبوں، مولویوں اور عام لوگوں سب میں ایک بیداری پیدا کر دی۔ کچھ مسلمانوں نے یہ اعتراض اٹھایا کہ جب سکھ اور مراٹھے مسلمان حکومت پر حملہ کر رہے ہیں، اور انہوں نے ایک مذہبی جنگ چھیڑ رکھی ہے، تب ایسی حالت میں ان خیالوں کا پرچار کرنا ایک مسلمان کے لئے کہاں تک جائز ہے؟ اس اعتراض کے جواب میں شاہ صاحب نے کہا کہ — ”کوئی بھی حکومت صرف اس لئے ہلائی حکومت نہیں ہو جاتی کہ اس کا بادشاہ مسلمان ہو۔ اس کے خلاف انصاف کے سہارے چلنے والی کوئی ایسی حکومت بھی مسلمان حکومت ہو سکتی ہے، جس کا بادشاہ مسلمان نہ ہو۔“

دھیرے دھیرے یہ سنگٹھن اتنا مضبوط ہوتا گیا کہ مولانا عبید اللہ سندھی کے نظموں میں — ”شاہ صاحب کی اس جماعت نے

باقاعدہ ایک عارضی حکومت (کام چلاؤ سرکار) قائم کر لی۔ اُس وقت شاہ صاحب کے کچھ شاگردوں نے حکومت کے خلاف تلوار اٹھانے پر زور دیا، شاہ صاحب نے انہیں منع کر دیا اور سمجھایا کہ جس طرح حضرت محمد نے تیرہ سال تک عدم تشدد یعنی آہستہ کے سہارے اپنا پرچار کیا یہاں تک کہ خود ہجرت کر گئے لیکن تلوار ہاتھ میں نہ لی، اُسی طرح ہمیں بھی چپ چاپ اپنے اپنے وچاروں کو پھیلانے کا کام کرتے رہنا چاہئے جب تک کہ اس انقلاب کی ہم پوری تیاری نہ کر لیں۔ کچھ دن بعد دہلی کے ایک حاکم نجف علی خاں نے شاہ صاحب کے ہاتھوں کے پنجے اتوا دئے، تاکہ وہ لکھ کر اپنا پرچار نہ کر سکیں اور اُن کے دونوں بیٹوں شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کو سلطنت سے باہر نکلوا دیا۔ شاہ صاحب اس ظلم کو ہنستے ہنستے سہہ گئے اور انہوں نے اس کے خلاف اُف تک نہ کی۔

آخر ۱۹۴۷ء میں اپنی جماعت کا تمام بوجھ اپنے پیٹے شاہ عبدالعزیز پر رکھ کر دے اس دنیا سے بڑا ہو گئے۔ جس ہندستان کی انہوں نے کھینا کی تھی، اُسے وہ اپنی آنکھوں نہ دیکھ سکے اور جس انقلاب کی انہوں نے نیو ڈالی تھی اُسے بھی دیکھنا انہیں نصیب نہ ہوا، پھر بھی ہندستان میں وہ ایک ایسی جماعت قائم کر گئے، جس نے زمانے کی ضرورتوں کے مطابق اپنے کو بدل کر ہندستان کو ایک ہرا بھرا رکت بنانے کی کوششوں میں پورا حصہ لیا اور آج قریب دو سو سال بعد بھی وہ نہ صرف زندہ ہے بلکہ ہمارے ملک کی جنگ آزادی میں جمعیتہ العلماء ہند کی شکل میں ایک خاص جگہ رکھتی ہے۔ شاہ ولی اللہ سے لیکر مولانا حسین احمد مدنی تک کا یہ سلسلہ ایک ایسی تاریخ ہے، جس کا

ہر پنا شہیدوں کے خون سے لال ہو۔ اور جس پر ہمارا ملک جتنا بھی گھنڈا کرے تھوڑا ہو۔

شاہ ولی اللہ نے کل ساٹھ برس کی عمر پائی۔ اُن کے ساتھ نہ کسی راجا یا نواب کی طاقت تھی اور نہ وہ خود گھر کے کچھ زیادہ آسودہ تھے۔ وہ ایک سیدھے سادے درویش تھے، جس کی دولت اُس کی دل کی سچائی اور فقیری ہوتی ہو اُن دنوں دلی کی ہر صبح ایک نئے انقلاب کا پیغام لے کر آتی تھی۔ اپنے اس چھوٹے سے زمانے میں انھوں نے دہلی کے تخت پر رس بادشاہوں کو بیٹھنے گرتے دیکھا۔ سادات بارہ کا تسلط، فرخ سیر کا ان کے ہاتھوں قید میں مرنا، طورانی امراؤں کے ہاتھوں سادات بارہ کا زوال، مرہٹوں کی بغاوت اور غوج، سکھوں کی بغاوت، نادر شاہ کا حملہ، دہلی کا قتل عام، محمد شاہ ابدالی اور پانی پت کی جنگ، سیاست ہند میں رہیلوں کی شرکت، ہندستان میں یورپیوں کا لالچ پھر نکال اور بہاریں انگریزوں کا عمل دخل، یہ تمام باتیں شاہ صاحب کی آنکھوں کے آگے سے گزری تھیں، پھر بھی اس بات پر اچرج ہوتا ہے کہ ملک کی بدقسمتی کی اُن کالی گھڑیوں میں جب بدیشیوں کی غلامی کی زنجیریں دنوں دن کڑی ہوتی جا رہی تھیں، کیسے اُن کی اُمیدوں کا چراغ آخیر تک اس شان سے جلتا رہا۔

شاہ صاحب کو اس دنیا سے گئے قریب پچھنے دو برس ہو گئے جس خربک کی مے بنو ڈال گئے تھے، وہ آج بھی جیوں کی تیوں قائم ہے۔ اُنکے پیچھے آنے والوں نے اُس پر کچھ نہ کچھ منزلیں کھڑی کی ہیں، کاش! ہم سب اپنے فرقہ وارانہ تنگ نظری سے اوپر اُٹھ کر اپنی اس عظیم انسان بزرگ سہی کو پہچان لیتے۔

شاہ عبدالغزیز

سنہ ۷۹۲ھ میں جب شاہ ولی اللہ صاحب کی انقلابی تحریک جو عام لوگوں کا راج یا آجکل کی زبان میں سوشلسٹ ڈیموکریٹک حکومت قائم کرنے کی تحریک کہی جاسکتی تھی، اپنا بچپن پار کر کے جوانی میں قدم رکھتی جا رہی تھی، شاہ صاحب دنیا سے چل بسے۔ اُن کے بعد شاہ صاحب کے بیٹے شاہ عبدالغزیز اپنے باپ کی جگہ اس تحریک کے دوسرے امام یعنی نیتا چنے گئے۔

شاہ عبدالغزیز اس وقت ۷ سال کے تھے۔ وہ صرف اسی لئے امام نہیں چنے گئے کہ وہ شاہ ولی اللہ کے بیٹے تھے، بلکہ اس لئے کہ پچھلے دو سال سے وہ بڑی ذمہ داری کے ساتھ اس تحریک کے کام میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹا رہے تھے اور بڑی ذمہ داری سے اپنے مدرسے میں تعلیم دے رہے تھے مولانا محمد عاشق ٹھٹھلی، مولانا محمد امین کاشمیری اور مولوی نور اللہ برہانوی جیسے دلی اللہ صاحب کے ساتھیوں تک نے اسی بات پر زور دیا کہ شاہ عبدالغزیز کی امامت کے اس کانٹوں بھرے تاج کو سنبھال سکتے ہیں۔

شاہ عبدالغزیز کی قابلیت کے بارے میں مشہور ہے کہ فارسی اور عربی کی بہت سی کتابیں اُن کی زبان پر تھیں اور ضرورت

پڑنے پر ان میں سے کام کی باتیں اور لمبی لمبی عبارتیں وہ زبانی بول کر نکھو ادا کرتے تھے۔ طالب علموں کے ساتھ ان کا برتاؤ اتنا اچھا تھا کہ جو ایک بار اُن کے پاس آگیا اس کا مدرسہ چھوڑ کر جانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ مذہبی جمید بھاؤ اُن میں نہیں تھا۔ اُن کے ایک براہمن دوست کبھی کبھی ہفتوں اُن کے ساتھ رہتے، اور اُن کے گھر پر ہی پوجا پاٹھ کرتے، سورج کو جل چڑھاتے، وید پاٹھ کرتے، پر شاہ صاحب کے گھر اُن کو کبھی کوئی دقت نہ ہوتی۔ مذہبی اُپدیش دیتے دقت بھی وہ اس بات کا بے حد خیال رکھتے تھے کہ کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو کسی کے بھی دل کو دکھا دے۔

ایسی اچھی فیزی طبیعت اور دوسروں کے دل نہ دکھانے کا اتنا خیال رکھتے ہوئے بھی شاہ صاحب کو اُس زمانہ کی سرکار اور کٹر خیال کے لوگوں کی طرف سے زندگی بھر کڑی مخالفت اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اُنھیں دوبار زہر دیا گیا۔ ایک بار پھسکی کا اُٹن اُن کے بدن سے ملوایا گیا جس سے اُنھیں کوڑھ کی بیماری ہو گئی۔ اس کے بعد بھی جب اُن کے دشمنوں نے دیکھا کہ وہ اپنے اصولوں پر جیوں کے تیوں قائم ہیں اور اُسی جوش اور دلیری کے ساتھ اپنی تحریک پھیلا رہے ہیں تو پھر حکومت کی طرف سے اُن کو دہلی سے دیش نکالا دیا گیا۔ حکم ہوا کہ دہلی سے باہر ایک خاص حد تک وہ کسی سوارہی کا استعمال بھی نہیں کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُنھیں جون پور تک پیدل جانا پڑا۔ راستے میں لو لگنے سے ہمیشہ کے لئے اُنکی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔

یہ تمام سختیاں شاہ عبدالعزیز ہنستے ہنستے بھیل گئے۔ وہ جانتے تھے کہ انقلاب کا راستہ ان تکلیفوں اور پریشانیوں کے جھاڑ جنکھاڑوں میں ہو کر ہی جاتا رہے گا۔ صبر کے ساتھ اُن کو برداشت کر لینے سے ہی کامیابی مل سکتی ہے۔۔۔

دیش نکلے کے زمانے میں شاہ صاحب نے کتنی ہی کتابیں لکھیں ان میں اُن کتابوں کا تفصیل دار جواب تھا جو اس عرصہ میں شاہ ولی اللہ صاحب یا اُن کی جماعت کے خلاف لکھی گئی تھیں۔ ان کتابوں میں سب سے زیادہ مشہور 'مختصر اثنا عشریہ' ہے۔ یہ فارسی میں ہے۔ دوسری ہے 'تفسیر فتح العزیز' جس میں شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب 'تفسیر فتح الرحمان' کی باتوں کو بڑے پھیلاؤ کے ساتھ سمجھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ 'بستان المحضین' (حدیث پڑھانے والوں کا حال) 'شرح میزان منطق' (منطق یعنی ترک پر) 'عجائب نافہ' (حدیث کے اصول) وغیرہ اور بھی بہت سی ایسی کتابیں لکھیں جو عربی فارسی کے سائنسیہ میں شاہ صاحب کا نام ہمیشہ روشن رکھیں گی۔

دیش نکالے کی سیوا ختم ہوتے ہی شاہ صاحب پھر دہلی آ موجود ہوئے اور تعلیم دینے کا کام شروع کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نئے نئے پیروں اور بدعتیوں یعنی اپنے مطلب کے لئے نئے نئے اصولوں کو گڑھ کر اُن کو ہی مذہبی فرض قرار دینے والوں کا زور تھا۔ ایک بزرگ کا کہنا ہے — "شہر بھر کے گنڈے اور بد معاش کلمے رکھائے، رنگین کپڑوں میں سجے سجھے صوفی بنے گھومتے تھے۔ معمولی آدمی ہی نہیں شاہزادے اور شاہزادیاں

بھی اُن کا مرید یا چیلہ ہونا اپنے لئے ایک بڑی بات سمجھتے تھے۔ اُن لوگوں کی ہمت یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ اُن میں سے کوئی کوئی مسجد کے ملاؤں کے پاس جا کر کہتے۔ ”اے مسجد کے مینڈھے! لاہیں کچھ دے۔“
 آج ہمیں..... جانا ہے، اور پیارے ملا کو اپنی جان چھڑانے کے لئے کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑتا تھا۔“

راج کا جی حالت یہ تھی کہ خاص دہلی میں ایک انگریز ریزیڈنٹ دہنے لگا تھا، جو کبھی خوشامد سے، کبھی لالچ سے، اور کبھی کبھی لال آنکھیں دکھا کر اُس وقت کے کمزور مغل بادشاہ سے من چاہے کام کرایا کرتا تھا۔ بنگال بہار کی دیوانی یعنی وہاں کی مال گزاردی وصول کرنے کا اختیار انگریز کمپنی کو سونپا جا چکا تھا اور وہاں کے لاکھوں گھرانے کمپنی کی ظالم حکومت کے نیچے دبے دبے کراہ رہے تھے۔ باقی ہندوستان میں بھی ایک دو ہندوستانی حکمرانوں کو چھوڑ کر سب کے سب راجے نواب انگریزوں کے ہاتھ کی کھٹ پتلی بنے ہوئے بے شرمی کے ساتھ ایک دوسرے پر غارتے رہتے تھے۔

یہ حالت برداشت کی حد پار کر چکی تھی اور ضروری ہو گیا تھا کہ قلم اور زبان کے ساتھ ساتھ تلووار کا بھی سہارا لیا جائے۔ اُس وقت شاہ صاحب کی جماعت کی بساط ہی کتنی تھی، پھر بھی چُپ بیٹھ سکنا مشکل تھا۔

شاہ صاحب نے اس کے لئے پہلا کام یہ کیا کہ ہندوستان کی

اُن سب جگہوں کو، جہاں آزاد اسلامی حکومت نہیں تھی۔ دارالحرب قرار دیدیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان جگہوں میں رہنے والے ہر مسلمان کا یہ مذہبی فرض ہو گیا کہ یا تو وہ حکومت کے خلاف تلوار اٹھائے یا اُس جگہ کو چھوڑ دے۔ اس زمانے کی حالت میں یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اور وہ بھی ایک ایسے معمولی فقیر کے لئے جو اپنے پیچھے صرف تھوڑے سے مرید رکھتا ہو، خود کوڑھ کی بیماری میں گرفتار ہو، آنکھوں کی روشنی جا چکی ہو، جس کی وجہ سے وہ اپنی جگہ سے ہٹنے جلنے میں بھی کسی دوسرے آدمی کا محتاج ہو۔

شاہ عبدالعزیز صاحب یہ قوسی دے کر ہی نہیں بیٹھ گئے، انقلاب کی فوجی تیاریوں کے لئے انھوں نے باقاعدہ ایک بورڈ بنایا۔ جس کے صدر شاہ صاحب کے شاگرد سید احمد صاحب بریلوی اور ان کے نائب شاہ صاحب کے بھتیجے شاہ اسماعیل اور شاہ صاحب کے داماد مولانا عبدالحمی بنائے گئے۔ اُس بورڈ نے جنتا کو ملک کا اصلی حال بتانے اور اس کے خلاف لڑنے کے واسطے رنیموٹ بھرتی کرنے کے لئے ہندستان کے الگ الگ حصوں کا دورہ شروع کیا۔ اپنے کام میں اس بورڈ کو نہایت کامیابی ہوئی، کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ جہاں بھی پہنچتے تھے، اُسی جگہ ہزاروں مسلمانوں کی بھیڑ اکٹھی ہو جاتی تھی، وہ لوگ سید احمد صاحب کی بیت کرتے تھے یہی ان کو اپنا گرو مان لیتے تھے اور ملک و مذہب کے لئے جان دینے کی قسم کھاتے تھے۔

گھومتے گھومتے جب یہ بورڈ رام پور پہنچا تو وہاں کے کچھ
انفانوں نے سید صاحب سے شکایت کی کہ پنجاب کی سکھ حکومت
انگریزوں سے مل رہی ہے۔ سید احمد صاحب پر اس کا بڑا اثر پڑا اور
انہوں نے سب سے پہلے سکھوں سے سلجھ لینے کا ارادہ کیا۔ اُس
دن سے انکی ملکی آزادی کی تحریک کچھ دنوں کے لئے ایک فرقہ دارانہ
تحریک بن گئی۔

اس تحریک کے سکھوں کی طرف ملتے ہی انگریز جو آج تک اُس
جماعت کو دشمنی کی نگاہ سے دیکھتے تھے اُسے اُس کے حمایتی بن گئے
اب جہاں جہاں سید صاحب جاتے، وہاں وہاں انگریز اُن کی آؤ
بھگت کرتے۔ کانپور میں تو کسی انگریز کی بیوی باقاعدہ سید صاحب
کی مرید بنی اور اُس نے کئی ہزار روپیہ اُن کی اور اُن کے کئی سو
سامتیوں کی خاطر داری میں خرچ کئے۔ یہاں پر یہ نہ بھول جانا
چاہئے کہ سید صاحب جس سکھ حکومت کے خلاف لڑنے کی تیاری
کر رہے تھے اُس کا راجا رنجیت سنگھ انگریزوں کا بہت گہرا دوست
تھا۔ دوست ہوتے ہوئے بھی انگریزوں کو اُس کی طرف سے بڑا ڈر
رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک طرف تو انگریز راجا رنجیت سنگھ کی دوستی
کا دم بھرتے تھے اور دوسری طرف اُس کی حکومت کے خلاف ان
تیاروں کو نہ صرف چپ چاپ برداشت کر رہے تھے، بلکہ اُس میں طرح طرح
کی مدد پہنچا رہے تھے۔ اصل میں اُنہیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی تھی کہ
جس جماعت سے انہیں اتنا بڑا خطرہ تھا وہ اب اپنے ہی ایک دلش باہی
سے ٹھکانے جا رہی ہے۔ اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو، یعنی سکھ حکومت کی جیت

ہو یا دشمن کا یاب رہے ، اگر یہ دونوں طرح اپنا فائدہ سمجھے ہوئے تھے ۔
اتنے ہی میں سید صاحب ایک بڑے جتھے کے ساتھ حج کو
تشریف لے گئے ۔ سکھوں سے انکی ٹکڑ رک گئی ۔

حج کے لئے روانہ ہونے کے لگ بھگ دو سال بعد یعنی سنہ ۱۸۲۴
میں شاہ عبدالعزیز کا ایک معمولی بیماری کے بعد انتقال ہو گیا ۔ اس
وقت آپ کی عمر اسی سال کی تھی ۔ جب تک جنے اپنے باپ کی
ہدایت کے مطابق اپنے ملک کو بدیشیوں کے اثر سے آزاد کرانے
کی کوشش کرتے رہے اسی خیال سے آپ نے سید احمد صاحب
کو نواب امیر خاں پٹاری کے لشکر میں داخل کرایا ۔ ہاں وہ
گھوڑ سوار فوج کے ایک اونچے عہدہ دار رہے ۔ بعد میں امیر خاں
نے جب انگریزوں سے صلح کر لی اور سید صاحب کے بار بار کہنے پر
بھی انگریزوں کے خلاف لڑنا منظور نہ کیا تو سید صاحب وہاں سے
الگ ہو کر شاہ صاحب کے پاس چلے آئے ۔ امیر خاں کی نوکری چھوڑتے
وقت آپ نے شاہ صاحب کو لکھا تھا کہ نواب صاحب اب انگریزوں
کے ساتھ مل گئے ہیں اس لئے یہاں رہنا فصول ہے اسی لئے میں نے
انکی نوکری بھی چھوڑ دی ہے ۔

شاہ صاحب اور سید احمد صاحب کسی بھی طرح انگریزوں کو ہندستان
میں ٹکنے دینا نہیں چاہتے تھے ۔

شاہ عبدالعزیز صاحب اپنے مرنے سے پہلے یہ وصیت کر گئے
تھے کہ میرے کفن دفن میں ذرا بھی شان شوکت سے کام نہ لیا
جائے ، وہ ہمیشہ موٹی دھوتر کا کرتہ اور کھدر کا پانچھاسہ یا

تہ بند پہنتے تھے اور اپنے کفن کے لئے بھی کھدر ہی کی وصیت کر گئے تھے۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے ایک بڑی بات جو اُن کے دل کا سچا پتہ دیتی ہے یہ کسی تھی کہ میرے جنازے میں شریک ہونے کی دعوت بادشاہ کو نہ دی جائے۔

یہ سب کیا گیا، پھر بھی جس شان شوکت کے ساتھ دکنی میں جنتانے اپنے اس سچے رہبر اور جاں نثار کو دفن کیا وہ بادشاہوں کو بھی نصیب ہونا مشکل ہے۔ بھیرا تھی تھی کہ جنازے کی نماز پچپن مرتبہ پڑھی گئی۔

اس طرح ملک میں عام لوگوں کی حکومت قائم کرنے کے لئے لڑنے والی اس جماعت کا یہ دوسرا امام بھی اپنی زندگی کا ایک ایک پل اسی فکر اور کشمکش میں بتا کر موت کی گود میں سو گیا۔

شاہ محمد اسحاق

شاہ عبدالعزیز نے شاہ ولی اللہ صاحب کی انقلابی تحریک کو کاغذ قلم اور بحث مباحثہ سے نکال کر بہت کچھ سپاہیانہ لباس پہنا دیا۔ اس کے بعد ۱۸۲۷ء میں شاہ عبدالعزیز اس دنیا سے چلے گئے اور شاہ محمد اسحاق اس تحریک کے تیسرے امام بنائے گئے۔ رشتے میں وہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے دھیوتے تھے، شاہ محمد اسحاق کا سارا پڑھنا لکھنا اپنے نانا کے مدرسے میں ہی ہوا تھا، اسی لئے ابھی جب تک اُن کے منہ سے ماں کے دودھ کی گندھ بھی اچھی طرح نہیں گئی تھی تبھی سے وہ اپنے بچے نانا شاہ ولی اللہ کے مشن اور اس کے اصولوں میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ اُن اصولوں کے پرچار کے سلسلے میں اُن کے نانا شاہ عبدالعزیز صاحب کو جو تکلیفیں بھیلنی پڑی تھیں وہ بہت کچھ شاہ محمد اسحاق نے اپنی آنکھوں دیکھی تھیں۔ اُنکی طبیعت پر اس کا بہت بڑا اثر تھا۔

شاہ عبدالعزیز نے اپنے دھیونے کو چھوٹی عمر سے ہی پہچان لیا تھا وہ سمجھ گئے تھے کہ اُن کے بعد اُن کی تحریک کو چلانے کے لئے سب سے زیادہ ٹھیک نیتا محمد اسحاق ہی ہو سکتے تھے۔ فوجی شگنوں کے لئے انھوں نے سید احمد صاحب کی صدارت میں مولانا عبدالحی اور شاہ اسماعیل صاحب کا ایک فوجی بورڈ بنایا، اُس کے ساتھ ہی تمام غیر فوجی کاموں جیسے پرچار وغیرہ کے لئے، ایک دوسرا بورڈ بنایا، جس کے صدر شاہ محمد اسحاق صاحب تھے۔ اس طرح اپنی زندگی میں ہی انھوں نے اپنے

پیارے دھیوتے کو ملک کے لئے ایک ایسی جماعت کی سرداری کا کانٹوں بھرا تاج پہنا دیا جسے انگاروں سے بھرے راستے سے گزر کر اپنی منزل تک پہنچنا تھا۔

۱۸۵۷ء میں شاہ محمد اسحاق صاحب نے اس انقلابی تحریک کی کمان ہاتھ میں لی۔ دہلی کے شاہی تخت پر اُس وقت سرمرٹ اکبر شاہ تھے پردہ نام ہی کے بادشاہ رہ گئے تھے۔ ہندستان کے اصلی مالک ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ امہرسٹ اور دہلی کے دربار میں کمپنی کا ریذیڈنٹ چارلس ٹکٹف تھے۔ ٹکٹف نے اپنے گھمنڈ بھرے برتاؤ اور گستاخیوں سے بادشاہ کے ناکوں دم کر رکھا تھا۔ یوں تو کچھ دنوں پہلے سے دہلی کی بادشاہت کمزور ہوتی جا رہی تھی پھر بھی ہندستان میں رہنے والے انگریز امنسٹرکم سے کم دکھاوے کے لئے بادشاہ کے ساتھ عزت کا برتاؤ کرتے تھے اور اپنے کو اس کی رعایا ظاہر کرتے تھے، لیکن لارڈ امہرسٹ اور چارلس ٹکٹف نے اس پردے کو بھی اتار کر پھینک دیا۔ اس سے پہلے دہلی کے دربار میں بہنے والا ہر انگریز ریذیڈنٹ اور سب درباریوں کی طرح بادشاہ کو ”تسلیم، کورنش اور مجرا“ کیا کرتا تھا اور شاہی خاندان کے ہر بچے کی مناسب عزت کرتا تھا، لارڈ امہرسٹ کی شہ پاکر چارلس ٹکٹف نے اس پر دم پڑا کو بل دیا اور بھرے دربار میں ایسی حرکتیں کرنی شروع کر دیں جو بادشاہ کی شان اور عزت میں بیڑہ لگانے والی تھیں۔ انگریزوں کی ہمت یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ بادشاہ اکبر شاہ نے جب اپنے ایک بیٹے مرزا سلیم کو اپنا ولی عہد بنانا چاہا تو انگریزوں نے اسے الہ آباد بھیج کر نظر بند کر دیا۔ اس

کے بعد جب بادشاہ نے اپنے دوسرے بیٹے نیلی کو اپنے بعد تخت کا
 حقدار بنانا چاہا تو انگریزوں نے اُس کی بھی مخالفت کی۔ ان باتوں
 سے تنگ آکر بادشاہ نے راجا رام موہن رائے کو اپنا ایچی بسا کر
 ولایت بھیجا اور برٹش پارلیمنٹ سے انصاف پانے کی کوشش کی،
 پر راجا رام موہن رائے کو بھی ناامید لوٹنا پڑا۔ انہماک کے حاکموں
 نے راجا رام موہن رائے کی ایک نہ سنی۔

جو حالت دہلی کی تھی، ٹھیک وہی حالت باقی ہندستان کی تھی۔
 آئے دن ہندستان کی ریاستوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر کسی نہ کسی راجا
 یا نواب کے گلے میں کمپنی کی غلامی کا طوق ڈال دیا جاتا تھا، اور جو مخالفت
 پر ڈٹ جاتا اُسے برباد کر دیا جاتا تھا۔ عام لوگوں کے ساتھ انگریزوں کے
 برتاؤ کی یہ حالت ہو چلی تھی کہ کہیں کہیں وہ اپنے سامنے کسی ہندستانی کا
 گھوڑے پر چڑھ کر نکل جانا بھی برداشت نہیں کرتے تھے، اور جگہ جگہ خاص کر
 کمپنی کی فوجوں کے اندر لوگوں کے مذہبی و سماجی معاملوں میں بھی دخل
 دینے لگے تھے۔

انگریز پادری کھلے عام ہندو مسلمانوں کے اوتاروں اور پیروں
 پر چھینٹے کستے تھے۔ ۲۲ مارچ ۱۸۳۲ء کو پارلیمنٹ کی سلیکٹ کمیٹی
 کے سامنے گواہی دیتے ہوئے کپتان ٹی مینن نے کہا تھا: ”بہت
 سے عزت دار ہندستانی مسلمانوں نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ
 گورنمنٹ عیسائی پادریوں کے ساتھ بڑی رعایتیں کرتی رہی ہے
 اور یہ پادری لوگ اُن کے مذہبی رواجوں کو بُرا کہنے اور
 بزرگوں کو گالیاں دینے تک کی حد تک پہنچ جاتے ہیں“ انہیں سے ایک

پوری ہندوستان جتنا میں تقریر کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "تم لوگ حضرت محمد کے ذریعے اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہو، لیکن حضرت محمد اس وقت x x x میں ہیں اور اگر تم لوگ ان کے اصولوں پر یقین کرتے رہو گے تو تم سب بھی x x x میں جاؤ گے۔"

یہ اُس وقت کے ہندستان کی ایک دھندلی سی تصویر ہو۔

شاہ محمد اسحاق صاحب کو امانت کی گدی سنبھالے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ سید احمد صاحب بھی حج سے واپس آ گئے۔ انھوں نے بھی شاہ محمد اسحاق صاحب کو اپنا نیا مانا۔ جب کبھی مدرسے کے اندر کوئی جلسہ ہوتا تھا، تو صدارت کی چوکی پر شاہ محمد اسحاق بیٹھتے تھے اور سید احمد صاحب نیچے بیٹھتے تھے، اور جب کوئی فوجی یا جنگی بحث ہوتی تھی خاص کر مدرسے سے باہر، تو فوجی بورڈ کے صدر کی حیثیت سے سید احمد صاحب صدارت کرتے تھے اور محمد اسحاق صاحب نیچے بیٹھتے تھے۔ مطلب یہ کہ گو سید احمد صاحب عمر میں بڑے تھے۔ پھر بھی اپنے استاد شاہ عبدالعزیز کی آخری وصیت کے مطابق تمام غیر فوجی کاموں میں محمد اسحاق صاحب ہی کو اپنا نیا مانتے تھے۔

حج سے واپس آنے کے کچھ دن بعد ہی سید احمد صاحب قریب نو ہزار ساتھیوں کو لے کر سندھ کے راستے کابل پہنچے اور پھر خیبر کے راستے پشاور لوٹ آئے۔ یہ تمام قافلہ بڑی دھوم دھام سے انگریزوں کا نکاری میں روانہ ہوا، لیکن انگریزوں نے اس میں کوئی روک تھام نہیں کی۔ وجہ صاف تھی۔ انگریز راجا رنجیت سنگھ کی طاقت سے بڑی طرح ڈرتے تھے۔ ایک طرف وہ راجا رنجیت سنگھ کے

دوست بنے ہوئے تھے اور دوسری طرف ملک بھر میں یہ جھوٹا پرچار کر رہے تھے کہ پنجاب کی سکھ حکومت مسلمانوں پر بڑے ظلم کر رہی ہے۔ انگریزوں کی یہ چال بہت کام کر گئی۔ کچھ دنوں میں ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے بھڑانے کا ارادہ رکھنے والی انقلاب کی یہ لہر سکھوں کی طرف مڑ گئی، اور اس کے بہادر نیتا اپنے دیش بھائیوں کے مقابلے میں ہی اڑ گئے۔

سید احمد صاحب سرحد کے پہاڑوں میں سکھ حکومت کے خلاف بڑی بہادری سے لڑے اور سکھ حکومت بھی بڑی بہادری سے اُن کا مقابلہ کرتی رہی۔ انگریز ایک طرف تو راجا رنجیت سنگھ کو سید احمد صاحب کے خلاف مدد دیتے رہے اور دوسری طرف جب دہلی کے ایک ہندو رئیس نے سید احمد صاحب کی جماعت کا وہ روپیہ جو اس کے یہاں جمع تھا 'دینے سے انکار کر دیا تو انگریزوں نے اُس پر زور ڈال کر وہ روپیہ سید احمد صاحب کے پاس سرحد بھیجوا یا۔ اس طرح انگریز برابر دونوں طرف لے رہے اور دونوں کی مدد کرتے رہے۔

۴ مئی ۱۸۴۸ء کو بالاکوٹ کے میدان میں سید احمد صاحب کو لڑتے لڑتے سکھ فوج نے مار ڈالا۔ سکھ فوج کے افسروں نے بڑی عزت کے ساتھ اُن کو دفن کیا۔ دوسری طرف اُن کے لشکر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ سید احمد صاحب کہیں غائب ہو گئے ہیں اور پھر واپس آویں گے۔ ہندوستانی اور سرحدی علاقے میں آج بھی ایک ایسی جماعت ہے جو اس پر یقین کرتی ہے کہ سید احمد صاحب ابھی زندہ ہیں اور سرحدی کاؤٹا ہیں۔

پر یہ ہے کہ وہ زور دار لہر جو انگریزوں کو ملک سے نکالنے کے لئے اٹھی تھی انگریزوں کی ہوشیاری سے اپنے ملک والوں ہی سے ٹکرا کر ختم ہو گئی۔

سید احمد صاحب کے مرنے کے بعد اس انقلابی پارٹی میں ایک دوسرے کے خلافت دو دل ہو گئے۔ ایک طرف شاہ محمد اسحاق اودان کے خیال کے لوگ یہ کہتے تھے کہ ملک کے اصلی دشمن انگریز ہیں اور ملک یا مذہب کی کوئی ترقی اُس وقت تک نہیں ہو سکتی، جب تک کہ انگریز کے پیر ہندستان میں جھے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہمیں سکھوں سے رہنے کے بجائے اپنے ملک والوں سے مل کر انگریزوں کو باہر نکالنا چاہئے دوسری طرف صادق پور کے مولانا ولایت علی اور اُن کے کچھ ساتھیوں کی رائے تھی کہ سکھوں کے خلافت لڑائی جاری رکھنی چاہئے۔ شاہ محمد اسحاق کی پارٹی کا زور رہا اس لئے مولانا ولایت علی دہلی کی مرکزی کمیٹی سے الگ ہو گئے۔ اُن کی اولاد آج بھی سرحد کے پہاڑوں میں موجود ہے۔

اب اس تحریک کا سیدھا مورچہ انگریزوں سے تھا۔ شاہ ولی اللہ کی تحریک کا یہ نیا دور تھا جو خالص نیشنل یا ملکی تھا۔ پورے گیارہ سال غور کرنے کے بعد شاہ محمد اسحاق صاحب نے ایک نیا پروگرام بنایا۔ انگریزوں سے رہنے کے لئے مولانا مملوک علی کی صدارت میں مولانا قطب الدین دہلوی، مولانا مظفر حسین صاحب کا ندھلوی اور مولانا عبدالحی کا ایک بورڈ بنا کر وہ خود گئے۔ وہاں انہوں نے ترکی سلطنت سے اپنے سمبندھ قائم کئے اور ترکی کی مدد سے انگریزوں کو ہندستان

سے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ دہلی کے بورڈ کو وہ برابر ہدایتیں بھیجتے رہتے تھے۔ کچھ دنوں میں انگریزوں کو شاہ محمد اسحاق صاحب کی کوششوں کا پتہ لگا۔ فوراً برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ترکی کی حکومت پر یہ زور ڈالا گیا کہ وہ شاہ محمد اسحاق صاحب کو جو اس وقت ترکی میں تھے اپنی حکومت سے باہر نکال دے۔ شاہ صاحب بڑی مصیبت میں پڑ گئے، وہاں کے ایک شیخ اکرم نام کے ایک شخص کی مدد سے انھوں نے یہ اجازت حاصل کر لی کہ وہ حجاز میں رہ سکتے ہیں۔

دہلی کا بورڈ انگریزوں کی نظروں سے بچا رہا کیونکہ اُس کے صدر مولانا مملوک علی تھے جو دہلی کالج میں پروفیسر تھے۔ کہا جاتا ہے مولانا مملوک علی کو بورڈ کا صدر اسی لئے بنایا گیا تھا، جس سے یہ تمام تحریک انگریز ریزیڈنٹ کی خونی آنکھوں سے بچی رہے۔ کچھ دن بعد جب تحریک کے انقلابی پن میں کچھ ہلکا پن آنے لگا تو شاہ محمد اسحاق صاحب نے اُن کی جگہ حاجی امداد اللہ صاحب کو مقرر کر دیا۔ یہ وہی حاجی امداد اللہ صاحب ہیں جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں شامی کے مورچے پر انگریزوں کے دانت کھٹے کر دئے تھے اور ۱۸۵۷ء کی کرائنتی ناکام ہونے پر اپنے دو ساتھیوں کو لے کر حجاز جا پہنچے تھے۔ انگریز سرکار لاکھ کوشش کرنے پر بھی انھیں گرفتار نہ کر سکی تھی۔

۱۸۵۷ء میں جب پورے ہندستان میں گیارہ برس بعد اگلے والے انقلاب کی گڑگڑاہٹ سنائی پڑنے لگی تھی۔ ہندستان سے باہر شاہ محمد اسحاق صاحب کا شریہ چھوٹ گیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی پاک تحریک کو فرقہ وارانہ بھاڑ بھنکاڑوں سے نکال کر پھر سے صحیح راستے

پر لانا انہیں کا کام تھا۔ اس طرح انہوں نے نہ صرف اُس جماعت
 کئی جس کے وہ امام تھے، بلکہ سارے ملک کی بھاری خدمت کی۔
 اس کے لئے انہوں نے اپنے ساتھیوں کا درود دھہا اور دیش
 بدیشوں کی خاک چھانی وہ اس جماعت کے تیسرے امام تھے، پھر بھی
 اس نئے دور کے وہ پہلے امام مانے جاسکتے ہیں۔ اس طرح اُن
 کی شخصیت انہاس کی نظر سے بہت اہمیت رکھتی تھی۔ شاہ ولی اللہ صاحب
 کی جماعت کا جو آج کل کا رخ ہے اس کا بہت بڑا سہرا شاہ محمد اسحاق صاحب
 کے سر پر ہے۔ وہ آزادی کے سپنوں کو لئے ہوئے اس دنیا سے چلے گئے
 کاش! وہ گیارہ سال اور بیٹھے رہتے اور عرصہ کے انقلاب کی ایک
 جھلک انہیں دیکھنے کو مل جاتی، جس میں اُن کے ساتھیوں اور شاگردوں
 نے بڑی ہمت اور دلیری سے حصہ لیا تھا۔

حاجی امداد اللہ صاحب

۱۸۴۶ء میں ولی اللہی جماعت کے تیسرے امام شاہ محمد اسحاق صاحب کاکے میں انتقال ہو گیا۔ اُن کی جگہ حاجی امداد اللہ صاحب اس جماعت کے چوتھے امام چُنے گئے۔ ۱۸۵۸ء میں محمد اسحاق صاحب کے مکہ چلے جانے کے کچھ برس بعد سے ہی اُن کی ہلاتوں کے مطابق حاجی امداد اللہ صاحب ہندستان میں اس سنگٹھن کو چلا رہے تھے۔ اُن کے کام کرنے کے ڈھنگ نے شاہ محمد اسحاق صاحب کے اور جماعت کے دوسرے کام کرنے والوں اور نیتاؤں کے دلوں میں اُن کے لئے گھر کر لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب آخری وقت میں شاہ محمد اسحاق صاحب نے ولی اللہی جماعت کی امامت کے لئے حاجی امداد اللہ صاحب کے نام کی وصیت کی تو سب کو ایسا معلوم ہوا جیسے شاہ صاحب نے اُن کے ہی دل کی بات کہہ دی ہو۔

حاجی امداد اللہ صاحب کی پیدائش ۱۲۳۳ھ ہجری میں قصبہ نانوت (سہارن پور) میں ہوئی تھی۔ آپ کا بچپن کا نام امداد حسین تھا۔ پڑھنے لکھنے میں آپ بچپن سے ہی بہت تیز تھے۔ یہ آپ کی ولک کی خوش قسمتی تھی کہ آپ کو شیخ محمد قلندر، شیخ الہی بخش صاحب کاندھلوی

اور شیخ نصیر الدین صاحب دہلوی جیسے گرومل سکے، جنہوں نے اپنے اس شاگرد کے دل کو خدا پرستی اور دلش بھکتی کی روشنی سے جگمگا دیا۔

حاجی امداد اللہ صاحب اپنے اُن اُستادوں کے ذریعے شاہ ولی اللہ صاحب کے اصولوں اور اُن کی جماعت کے کاموں سے واقف ہوئے اور پھر خود اُس میں شریک ہو گئے۔ شروع میں اُن کا تعلق سید احمد صاحب بریلوی اور اُن کی اُس جماعت سے رہا جو سرحد پر انگریزوں سے جنگ کر رہی تھی۔ لیکن ۱۳۱۸ھ میں جب سید احمد صاحب بالاکوٹ کے میدان میں مارے گئے تب آپ نے دلی کے مدرسے سے اپنا ناتا پھر سے جوڑنے کی ضرورت دیکھی۔ یہ ایک بڑی بات تھی۔ کیونکہ اُس وقت تک سید احمد صاحب کی جماعت کے لوگ اس خیال کے ہو چکے تھے کہ دلی کے مدرسے سے کوئی واسطہ نہ رکھ کر اپنا الگ سنگٹھن بنایا جائے اور سکھوں کے خلاف جہاد جاری رکھا جائے۔ پر حاجی امداد اللہ صاحب اچھی طرح جانتے تھے کہ ملک کے اصلی دشمن سکھ نہیں انگریز ہیں۔ اُس وقت سکھوں اور انگریزوں میں گہری دوستی تھی لیکن یہ صرف انگریزوں کی ایک چال تھی جس سے سکھ اور مسلمان آپس میں منکر اکرا کر ایک دوسرے کی طاقت کمزور کرتے رہیں اور انگریزوں کی طاقت بڑھتی رہے۔

اس خیال کو لے کر جب حاجی امداد اللہ صاحب دلی پہنچے تو معلوم ہوا کہ دلی کے مدرسے کے امام شاہ محمد اسحاق صاحب مکہ جا چکے

ہیں اور وہیں ہندستان میں اپنے سنگٹھن کو مضبوط کرنے میں بچے بچے ہیں۔ آپ شاہ محمد اسحاق صاحب سے ملنے کے لئے فوراً گئے۔ وہاں قریب ایک سال تک رہ کر شاہ محمد اسحاق صاحب سے صلاح مشورہ کرتے رہے کہ ہندستان میں لوگوں کو کیسے جگایا جاوے اور کیسے انقلاب پیدا کیا جاوے۔ شاہ محمد اسحاق صاحب پر اُن کی اس ایک سال کی سنگت کا یہ اثر پڑا کہ انھوں نے حاجی امداد اللہ صاحب کو اپنا نائب امام یا 'مشیر' بنا دیا۔ حاجی امداد اللہ صاحب ۱۲۶۱ھ ہجری میں ہندستان لوٹے اور یہاں اسی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۲۶۶ھ میں شاہ محمد اسحاق صاحب کے انتقال ہو جانے پر اس جماعت کا پورا بوجھ حاجی امداد اللہ صاحب پر آ پڑا۔

۱۲۶۶ھ کا زمانہ ہندستان کے لئے بڑی اُتھل پھٹل کا تھا۔ یوں تو ہندستان کی سرزمین پر جب سے انگریزوں نے پیر رکھا تبھی سے یہاں کے لوگوں کے لئے سکھ کی نیند سونا حرام ہو گیا، لیکن ادھر جیوں جیوں دلی کے مغل بادشاہ کی حالت اور طاقت کمزور ہوتی گئی تیوں انگریزوں کے ظلم اور جبر بھی بڑھتے چلے گئے۔ اس ظلم اور جبر کے خاص نشانہ کا راسِ وقت مسلمان تھے۔ کیونکہ ولی اللہی جماعت کی تحریک نے مسلمانوں میں جو بیداری پیدا کر دی تھی اُسے کہنی کے نائندے اور حاکم پھوٹی آنکھوں بھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ لارڈ الیزونے جو ۱۲۶۲ھ سے ۱۲۶۴ھ تک ہندستان کے گورنر جنرل رہے، اپنے ۱۸ جنوری ۱۲۶۴ھ کے ایک

خط میں ڈیوک آف ویلنگٹن کو لکھا تھا۔ ”میں اس حقیقت کی طرف سے اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتا کہ مسلمان قوم بڑے ہی ہماری دشمن ہے، اس لئے ہماری سچی پالیسی ہندوؤں کو اپنی طرف ملائے رکھنے کی ہونی چاہئے۔“ اپنی گورنر جنرلی کے وقت میں وہ اپنی اسی چال کے مطابق کام کرتے رہے۔

مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں کے دلوں میں نفرت اور غصہ پیدا کرنے کے لئے لارڈ البروس نے لکڑی کے دو دروازے تیار کرائے۔ پھر ان دروازوں کی بابت یہ مشہور کیا گیا کہ یہ سونا تھ کے مندر کے وہ دروازے ہیں جن کو محمود غزنوی مندر کے پھاٹک سے اُتر دالے گیا تھا۔ لارڈ البروس نے ۱۶ جنوری ۱۸۵۸ء کو ہندستان کے تمام ہندو سرداروں اور راجا ہمارا جوں کے نام ایک اعلان شائع کیا۔ اس اعلان میں انگریزوں اور انگریز سرکار کو ہندوؤں کا خاص حمایتی بتایا اور کہا کہ ان دروازوں کو انگریز غزنی سے لے آئے ہیں اور سونا تھ کے مندر میں ہم ان کو پھر سے لگوا دیں گے۔ اس کے بعد ان دروازوں کے جگہ جگہ جلوس نکلوائے گئے۔ بعد میں پتہ چل گیا کہ دروازے جعلی تھے۔ وہ جعلی دروازے آج تک آگرے کے محلے میں رکھے ہوئے ہیں۔

یہ تو انگریزوں کی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کی ایک مثال ہے، جو تمام ہندستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ کمپنی کے علاقے میں عام جنتا کے ساتھ انگریزوں کا برتاؤ یہ تھا کہ اگر کوئی

ہندوستانی گھوڑے پر سوار ہو کر انگریزوں کے سامنے سے نکلتا تھا، تو وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ادبچی سے ادبچی حیثیت کے ہندوستانی کو ایک معمولی انگریز ٹامی کی عزت کے لئے گھوڑے سے اُترنا پڑتا تھا۔ تمام ملک میں ہندو یا مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے بڑے جوش کے ساتھ کام ہو رہا تھا۔ اس بارے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں کی کمیٹی کے صدر مسٹر مینگوس نے ایک بار انگلینڈ کی پارلیمنٹ میں کہا تھا۔ ”پرہیزمانے ہندستان کا لمبا چوڑا سماج انگلستان کو اس لئے سونپا ہے کہ ہندستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک عیسائی مسیح کا جھنڈا پھرنے لگے۔ ہم میں سے ہر ایک کو اپنی پوری طاقت اس کام میں لگا دینا چاہئے جس سے تمام ہندستان کو عیسائی بنانے کے کام میں دلش بھر میں کہیں سے ذرا بھی ڈھیل نہ آنے پاوے۔“

یہ، عیسائی بنانے کا کام، کہیں ہسپتال کھول کر تو کہیں ہندوستانی فوجی امینوں کو عیسائی مت میں داخل ہونے پر ترقی دینے کے سہارے چل رہا تھا۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ اسکول قائم کئے جا رہے تھے جن میں عیسائی پادری ہندوستانی بچوں کے دلوں پر یہ چھاپ ڈالنے کے لئے دن رات محنت کرتے تھے کہ ہندوستان ہمیشہ سے ایک پھیرا ہوا ملک ہے، دنیا میں سچا مذہب صرف مسیحائیوں کا ہے اور اس میں داخل ہونے پر ہی ان کو دنیاوی اور روحانی ترقی حاصل ہو سکتی ہے۔

دلی میں شاہی تخت پر اس وقت بہادر شاہ تھے، جن کے

ہر ایک کام میں انگریز رزیڈنٹ ڈسٹائی کے ساتھ دخل دیتا رہتا تھا۔ اگر بادشاہ ایک شاہ زادے کو اپنا وارث بنانا چاہتے تھے تو انگریز رزیڈنٹ دوسرے شاہ زادے کا نام لیتا تھا اور اسکو ابھار کر شاہ زادوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرتا تھا۔ اُس وقت سے پہلے گورنر جنرل کی مہر میں 'بادشاہ دلی کا فدوی خاص' لفظ کھدے رہتے تھے، لیکن اب وہ نکال دے گئے۔ سب ہندستانی سرداروں و رئیسوں کو یہ سخت ہدایت کر دی گئی کہ وہ ان لفظوں کا استعمال نہ کریں۔ اس طرح بادشاہ کی حیثیت صرف وظیفہ پانے والے ایک چھوٹے سے رئیس کی سی ہو گئی تھی۔ یہی حالت ملک کے دوسرے راجا نوابوں کی تھی۔ اس طرح تمام ہندستان میں اُس وقت اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔

حاجی امدا اللہ صاحب ان مشکلوں سے نہیں گھبرائے۔ انھوں نے پہلے اپنی جماعت کا پھر سے سنگٹھن کیا۔ بد قسمتی سے اُس وقت دلی الہی جماعت میں بھی دو گروہ ہو چکے تھے۔ ایک گروہ کے نیتا مولانا ولایت علی صادق پوری تھے۔ انھیں یہ یقین تھا کہ سید احمد صاحب بریلوی بالاکوٹ کے میدان میں نہیں مارے گئے، بلکہ کسی وجہ سے چھپ گئے ہیں اور وہ جب بھی ٹھیک سمجھیں گے تب ظاہر ہو کر ملک کے دشمنوں کے ساتھ پھر سے لڑائی شروع کریں گے۔ اس گروہ کے لوگ اپنے اسی یقین پر برابر آدمیوں کی بھرتی کر رہے تھے اور روپیہ بھی اکٹھا کر رہے تھے، لیکن وہ انگریزوں کے ساتھ لڑائی پھیلنے کو تیار نہیں تھے اور سید احمد صاحب کے انتظار میں بیٹھے رہنا چاہتے

تھے۔ حاجی امداد اللہ صاحب نے اُن کو ساتھ لینے کی کوشش کی، لیکن ناکامیاب رہے۔ آخر کار ان لوگوں سے الگ رہ کر ہی اُن کو کام کرنا پڑا۔

اُس وقت حاجی امداد اللہ صاحب کے خاص ساتھیوں میں مولانا عبدالغنی صاحب، مولانا محمد یعقوب صاحب، مولانا محمد قاسم صاحب و مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی تھے۔ ان ساتھیوں کو لے کر اُنھوں نے جگہ جگہ گھومنا شروع کیا اور عام جنتا کو بتلایا کہ انگریزوں کی عملداری کے خلاف تلوار اٹھانے کا اس سے بہتر موقع دوسرا نہیں ہو سکتا۔

اس کے لئے اُنھوں نے اپنے دلی کے مدرسے کے تمام پڑانے طالب علموں کے ساتھ نئے سرے سے تعلق پیدا کئے اور کچھ ہی دنوں میں اپنے سنگٹھن کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

لارڈ ڈلہوزی کی ریاستوں کو ضبط کرنے اور ہندوستان کے راجا رکیسوں کو بے عزت کرنے کی پالیسی نے بھی حاجی امداد اللہ صاحب کے کام میں کافی مدد دی۔ راجاؤں اور رئیسوں کا یہ طبقہ، جو تب تک چھوٹی موٹی چالوں اور لالچوں میں بھینس کر انگریزوں کے ساتھ اپنے بھائیوں اور برابر والوں کے خلاف لڑنے لگتا تھا، اب مل جل کر انگریزوں کے خلاف تلوار اٹھانے کو تیار ہو گیا۔ لیکن حاجی امداد اللہ صاحب کو اُنہا پر پورا بھروسہ نہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اصلی طاقت جنتا کی طاقت ہو اور کوئی بھی آزادی کی لڑائی جب تک نہیں چل سکتی، جب تک کہ عام جنتا اُس میں حصہ نہ لے

اس لئے راجا نوابوں سے تعلق پیدا کرنے کے پھیر میں نہ پڑ کر وہ اپنی تقریروں اور تحریروں سے عام جنتا اور خاص طور پر مسلمانوں کے بیچ پرچار کرتے رہے۔ حاجی امداد اللہ صاحب ایک انقلابی نیتا ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے درجے کے صوفی اور فقیر بھی تھے۔ ان کی زبان میں جادو کا اثر تھا۔ وہ جس سے ملتے اُس پر گہرا اثر ڈالتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۵۷ء میں آزادی کی لڑائی شروع ہوتے ہی ہزاروں مسلمان ان کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ اُن کے تمام شاگردوں نے اور دسی کے مدرسے کے سب پڑانے طالب علموں نے اپنی اپنی جگہ سے اُس آزادی کی لڑائی کے لئے کافی زرگروٹ دے دی اور جب تک لڑائی چلتی رہی تب تک اُس میں آگے بڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ حاجی امداد اللہ صاحب خود بھی (اس موقع پر صرف وعظ (اپڈیشن) اور تقریروں تک ہی نہیں رہے، بلکہ شاملی کے مورچے پر ایک سہ سالہ کی حیثیت سے حصہ لے کر اُنھوں نے یہ دکھا دیا کہ وہ جتنے جوش کے ساتھ تقریر اور تحریر کے میدان میں اترتے تھے اتنی ہی قابلیت کے ساتھ لڑائی کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھا سکتے تھے۔ شاملی کی ۱۸۵۷ء کی لڑائی میں اُنکے چاروں ساتھی مولانا عبدالغنی صاحب، مولانا محمد یعقوب صاحب، مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اپنے اس امام کے ساتھ کندھ سے کندھا ملا کر لڑ رہے تھے۔

حاجی امداد اللہ صاحب نے اس موقع پر ایک بار پھر یہ کوشش کی کہ مولانا ولایت علی اور اُن کے ساتھی

بھی اس آزادی کی جنگ میں شریک ہو جائیں اور اُن کے ذریعے سرحد کے پٹھانوں کی مدد بھی مل جائے۔ اس کے لئے انھوں نے اپنے کچھ شاگردوں کو سرحد کی طرف بھیجا لیکن پنجاب کے چیف کمشنر سر جان لارنس نے سرحد کے کچھ ملاؤں کو پہلے سے ہی رشتوں دیکر اپنی طرف ملا لیا تھا۔ یہ ملا برابر اس بات کا پرچار کرتے رہے کہ یہ لڑائی کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ اصل لڑائی تو تب شروع ہوگی جب سید احمد صاحب بریلوی پھر سے ظاہر ہونگے، اس پر چار نے حاجی امداد اللہ صاحب کی کوشش کو ناکام کر دیا۔ البتہ پشاور اور ہوتی مردان کی چھاؤنیوں میں رہنے والی کچھ پٹھان پلٹنوں نے اس لڑائی میں شریک ہونے کی ضرورت کو محسوس کی پر وقت سے پہلے ہی انگریزوں کو اُن کے ارادوں کا پتا چل گیا۔ اُن سے ہتھیار رکھوائے گئے اُن میں سے ایک بڑی تعداد کو توپوں کے منہ سے اڑوا دیا گیا۔

دھیرے دھیرے سن ستاون کی یہ آگ ٹھنڈی پڑنے لگی۔ انگریزوں نے تمام ہندستان میں اس کا سخت بدلا لینا شروع کیا۔ اس بدلے کے لشکار خاص طور پر مسلمان ہوئے کیونکہ انھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا۔ انگریز اس بات سے لتنے چڑھ گئے تھے کہ ہزاروں ہی آدمیوں کو صرف مسلمان ہونے کے قصور میں پھانسی پر چڑھا دیا گیا، یا اس لئے مار ڈالا گیا کہ ڈاڑھی رکھنے کی وجہ سے وہ مسلمان معلوم ہوتے تھے۔ ان لوگوں میں بھی ولی اللہی جماعت کے کام کرنے والوں کو کھوج کھوج کر ٹھانے

اور برباد کرنے کی کوشش کی گئی۔ حاجی امداد اللہ صاحب اور ان کے ساتھیوں کو خاص طور پر گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی لیکن رشید احمد صاحب گنگوہی کے سوا اور کوئی گرفتار نہیں کیا جاسکا۔

حاجی امداد اللہ صاحب نے ان تمام باتوں پر ایک بار پھر غور کیا اتنی بڑی اور ملک بھر میں پھیلی ہوئی کوشش کی ناکامی نے ان کے دل کو بڑا صدمہ پہنچایا۔ ان کے ہزاروں شاگرد اور ساتھی پھانسی پر چڑھادے گئے تھے یا فرار رہ کر انگریزوں کے پنجوں سے اپنی حفاظت کرتے پھرتے تھے۔ پھر بھی ایک سچے کرائت کاری کی طرح ایسی حالت میں بھی انھوں نے ہمت نہ ہاری۔ اپنے ساتھیوں سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد انھوں نے ہندستان کا کام مولانا محمد قاسم صاحب پر چھوڑا اور خود مولانا محمد یعقوب صاحب اور مولانا عبدالغنی صاحب کے ساتھ چھپتے چھپتے مکہ جا پہنچے۔

مکہ میں پہنچنے کے بعد حاجی امداد اللہ صاحب نے ہندستان میں اپنے کئے ہوئے سنگٹھن کو پھر سے جمانے کی کوشش کی۔ اس کے لئے وہ برابر ہندستان میں مولانا محمد قاسم صاحب کے پاس ہدایتیں بھیجتے رہے۔ اس وقت سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مولانا محمد قاسم صاحب کے نام بھی وارنٹ تھا۔ اس لئے کچھ دنوں تک اس کام میں کوئی خاص سرگرمی نہیں دکھائی دی۔ برسوں بعد عام معافی کے اعلان ہونے پر حاجی رشید احمد صاحب گنگوہی چھوٹ کر آ گئے۔ اب مولانا

قاسم صاحب کو ایک ساتھی مل گیا۔ اُس وقت ہندستان کی حالت یہ تھی کہ لوگ انگریز کے خلاف سوچنے میں بھی ڈرتے تھے۔ جگہ جگہ جاسوسوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ مسلمان مولویوں پر خاص طور پر نظر رکھی جاتی تھی۔ سنہ ستاون کے بعد انگریزوں کے ظلم کی یاد لوگوں کے دلوں میں تازہ تھی۔ اُس نے دلوں میں ڈر بٹھا دیا تھا۔

سب حالت پر غور کرنے کے لئے ولی اللہی جماعت کے تمام خاص خاص نیتا حجاز میں جمع ہوئے اور بہت غور کرنے کے بعد حاجی امداد اللہ صاحب کی رائے سے یہ طے پایا کہ جس طرح سب سے پہلے امام شاہ ولی اللہ صاحب نے مدرسے کے ذریعے اپنے اصولوں اور خیالوں کا پرچار کیا تھا، اُسی طرح مسلمانوں میں پھیلی ہوئی موجودہ کم ہمتی اور اُن میں انگریزی سلطنت و انگریزی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثر کا مقابلہ کرنے کے لئے پھر سے ایک مدرسہ قائم کیا جائے۔ یہ بھی طے ہوا کہ یہ مدرسہ کسی ایسی معمولی جگہ قائم ہو جہاں وہ انگریزوں کی نظر سے بچا رہ سکے۔

اس فیصلے کو عمل میں لانے کی ذمہ داری مولانا محمد قاسم صاحب پر دی گئی اور رشید احمد صاحب گنگوہی اُن کے نائب بنائے گئے۔

اس کے بعد حاجی امداد اللہ صاحب ^{۱۳۱۷} ہجری عیسوی قریب ۱۸۹۷ء تک زندہ رہے اور اپنے گرو شاہ محمد اسحاق صاحب کی طرح مکہ ہی سے اس انقلابی جماعت کو مدد پہنچاتے

رہے۔ جو مسلمان راج کے لئے مکہ پہنچتے تھے اُن کے ذریعے حاجی امداد اللہ صاحب اپنا شغل ہندستان سے بنائے رکھتے تھے اور یہاں کے لئے ہدایتیں وغیرہ بھیجتے رہتے تھے۔ اُن کے آخری شاگردوں میں اب سب سے زیادہ مشہور مولانا حسین احمد صاحب مدنی ہیں جو دلی الہی جماعت کے موجودہ امام اور آزادی کی لڑائی کے ایک جانے مانے ہوئے بہادر سپہ سالار ہیں۔

اس طرح مسئلہ ہجری کی کسی تاریخ کو ۸۴ سال کی عمر میں ہندستان کا یہ بہت بڑا صوفی، بہت بڑا فقیہ، بہت بڑا کرائٹکاری بہت بڑا عالم اور دلی الہی جماعت کا چوتھا امام موت کی گود میں جاسویا۔ مرتے مرتے بھی اُن کے دل میں اپنے وطن کی ایک جھلک دیکھنے کی حسرت تھی، پر ساتھ ہی یہ تسلی تھی کہ کم سے کم برٹش جھنڈا اُن کے سر پر نہیں اُڑ رہا ہو۔

مولانا محمد قاسم

۱۸۵۷ء کی آزادی کی لڑائی ناکامیاب ہو جانے کے بعد ولی اللہی سنگٹھن کے چوتھے نیتا حاجی امداد اللہ صاحب مکہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ مکہ جانے سے پہلے انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں میں ملک کی آزادی کے لئے لڑنے اور سنگٹھت ہونے کے اصولوں کا پرچار کرنے کا کام مولانا محمد قاسم صاحب کو سونپا۔ اُس وقت مولانا محمد قاسم صاحب کے سامنے ایسی دقتیں تھیں جن کا پورا پورا خیال بھی اس وقت نہیں کیا جاسکتا۔

اُن کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی دقت تو یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں حصہ لینے کے جرم میں سرکاری جاسوس ہاتھوں میں پھانسی کا پھندا لائے جگہ جگہ اُن کی موجودگی سونگھتے پھرتے تھے۔ مولانا کو پھانسی کا ڈر تو نہ تھا کیونکہ اگر ڈر ہوتا تو وہ حاجی امداد اللہ صاحب کے ساتھ ہی مکہ جاسکتے تھے، لیکن وہ زندہ رہنا چاہتے تھے جس سے اس تحریک کو بوجھلے قریب ڈیڑھ سو برس سے چلتی آ رہی تھی اور جس کو شاہ ولی اللہ صاحب سے لے کر حاجی امداد اللہ صاحب کے زمانے تک بڑے بڑے دیش بھکتوں نے اپنے خون سے سیرجیا تھا، کسی طرح آگے بھی زندہ رکھ سکیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ حاجی امداد اللہ صاحب کا مکہ چلا جانا ہی ٹھیک ہی۔ کیونکہ زیادہ مشہور ہونے کی وجہ سے ان کے جلد کپڑ جانے کا خطرہ ہی

اور باقی کے ساتھیوں میں میں ہی ایسا ہوں جو اس تحریک کو، جو اس وقت قریب قریب بالکل ہی ختم ہو چکی ہو، پھر سے زندہ کرنے کے لئے کچھ کام کر سکتا ہوں۔ یہ ولی اللہی سنگٹھن اور اس کے نیتاؤں کی ایمان داری کا ایک بڑا ثبوت ہے کہ ایسے وقت میں بھی ان کے نظام میں کسی طرح کی پھوٹ نہیں پڑی۔ تحریک کے امام نے جس سے یہ کہا کہ وہ ان کے ساتھ مکہ چلے، وہ چلا گیا اور جس سے یہ کہا کہ وہ ہندستان ہی میں رہے وہ ہندستان میں ہی رہا۔

مولانا محمد قاسم صاحب کے سامنے ایک دوسری دقت یہ تھی کہ شہلہ کی ناکامیابی اور اس کے بعد کے انگریزوں کے ظلوں نے مسلمانوں میں بڑی پست ہمتی پیدا کر دی تھی۔ ایک عام خیال یہ پیدا ہو گیا تھا کہ انگریزوں کی طاقت اتنی بڑی ہے کہ ان سے رٹنے کا خیال کرنا اپنی وقوم کی بربادی کو نبوتا دینا ہے۔ اس سے یہ بھی خیال پیدا ہوا کہ جب انگریزوں سے اس وقت رٹنا نہیں ہے اور ان کی حکومت میں ہی رہنا ہے تو کیوں نہ ان سے زیادہ سے زیادہ رعایتیں حاصل کی جائیں اور ان کے دل میں یہ بات بٹھادی جائے کہ مسلمان قوم اب انگریزوں کی اتنی ہی وادادہ ہے جتنی ہندستان کی دوسری قومیں۔ اس لئے مسلمان نوجوانوں کو بھی تعلیم اور نوکریوں میں دوسری قوموں کی طرح حصہ ملنا چاہئے۔

ایسا خیال رکھنے والوں میں کچھ ایسی بڑی بڑی ہستیاں بھی تھیں جنہوں نے اپنے چال چلن اور قابلیت کی وجہ سے مسلمانوں پر بہت اثر رکھتی تھیں۔

اس خیال کے لوگوں میں سب سے بڑی ہستی سرسید احمد خاں صاحب کی تھی جو مولانا مملوک علی کے شاگرد ہونے کی وجہ سے مولانا محمد قاسم صاحب کے گرد بھائی ہوتے تھے۔ سرسید احمد صاحب ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے ہی انگریزوں کی نوکری میں آچکے تھے اور انگریزوں کی رہن سہن و ان کے کام کرنے کے ڈھنگ کا ان پر گہرا اثر پڑا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد انگریزوں نے دلی میں جو قتل عام کیا تھا، اس میں سرسید احمد صاحب کے ایک سگے چچا لائے گئے تھے۔ اور ان کی بوڑھی ماں کو ایک نوکر کے گھر میں چھپ کر جان بچانی پڑی تھی۔ جیسا کہ سبھی جانتے ہیں، سید احمد صاحب نے غدر کے وقت اپنی جان خطرے میں ڈال کر بھی کئی انگریزوں کی جان بچائی تھی۔ اس لئے جب انگریزی فوجوں کے ذریعہ اپنے خاندان کی اس بربادی کا حال انھوں نے سنا تو اس کا اثر ان پر پڑنا لازمی تھا۔ اُس زمانے میں انکی لکھی مشہور کتاب ”اسباب بغاوت“ میں ہم اس اثر کو آسانی سے محسوس کر سکتے ہیں۔ لیکن جلد ہی وہ سرخیوں میں بہہ چلے۔ اس وقت سرکاری نوکریوں سے مسلمانوں کو الگ رکھنے کی انگریزوں کی پالیسی نے ان کے دل پر گہرا اثر ڈالا اور انھوں نے محسوس کیا کہ اس طرح ہندوستان کے مسلمانوں کو گہرا دھکا لگے گا، اور وہ تعلیم و دوسری چیزوں میں ہندوستان کی دوسری قوموں سے بڑی طرح پچھڑ جائیں گے۔ اس سے بچنے کا انھیں صرف ایک ہی راستہ سوچا کہ مسلمانوں کے دلوں سے انگریزوں اور انگریزی تہذیب کے لئے جو نفرت

ہو وہ نکال دی جائے اور انگریزوں کے دل سے بھی مسلمانوں کے باغی ہونے کا خیال مٹا دیا جائے۔

سر سید احمد صاحب اپنے عقیدے کے سچے محنتی اور قوم کی بچھی بھلائی چاہنے والے تھے۔ ان کے دل میں اپنی قوم کے لئے اتنا ہی درد اور اُس کی ترقی کے لئے قربانی کرنے کا دیسا تھا۔ جذبہ تھا جیسا مولانا محمد قاسم صاحب کے دل میں تھا۔ دونوں ایک ہی استاد کے شاگرد تھے۔ پھر بھی دونوں کا راستہ نہ صرف ایک دوسرے سے الگ بلکہ ایک دوسرے کے خلاف تھا۔ ایک کو انگریزوں کی ہر ایک چیز میں نئی روشنی اور خوبی ہی خوبی نظر آتی تھی تو دوسرے کو انگریزوں کی چھایا سے بھی نفرت تھی۔ ایک انگریزوں کی وفاداری میں ہی قوم اور ملک کی ترقی دیکھتا تھا تو دوسرے کے لئے انگریزوں کی مخالفت نہ کرنا اپنے ایمان کو دھوکا دینا تھا۔ یہ اس بات کی جیتی جاگتی مثال ہے کہ کبھی کبھی ایک ہی مقصد ہوتے ہوئے بھی وہ نہایت سچے اور نہایت قابل انسانوں میں بھی کتنا گہرا فرق اور ورودھ ہو سکتا ہے۔

اس طرح مولانا محمد قاسم صاحب کے سامنے دوسری بڑی مشکل یہ تھی کہ سوشلزم کے انقلاب کی ناکامیابی کی وجہ سے پست ہمت مسلمانوں میں انگریزوں کے لئے وفاداری رکھنے اور اُن کی تہذیب کو اپنانے کا پد چار جاری ہو چکا تھا۔ اس پر چار میں انگریز ہر طرح سے بھاری مدد دے رہے تھے۔ دوسری طرف ایک کے بعد دوسری سازشوں کے مقدمے چلا کر انگریز سرکار مسلمان مولویوں اور

عالموں کو لمبی لمبی سزائیں دے کر کالے پانی بھیج رہی تھی۔ ایسی حالت میں مولانا محمد قاسم صاحب کے سامنے یہ سوال پیش تھا کہ ان چیزوں کا مقابلہ کس طرح کیا جاوے اور مسلمانوں کو دلی اللہی جماعت کے بھندڑے کے نیچے لا کر ان میں آزادی کے خیالات کیسے پیدا کئے جائیں۔

کچھ دنوں کے بعد جب حجاز سے حاجی ابد اللہ صاحب نے کسی معمولی سی جگہ پر ایک مذہبی مدرسہ قائم کرنے کی (سکیم مولانا قاسم صاحب کو بھیجی تو ان کو اس اندھیرے میں تھوڑی روشنی نظر آئی اور ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے صرف دس برس بعد یعنی ۱۹۱۷ء میں عربی تاریخ ۱۵۔ محرم ۱۳۸۳ ہجری کو سہارنپور سے بائیس میل دور دیونا جیسے ایک نہایت معمولی قصبہ میں انھوں نے دارالعلوم (علم کا گھر) کے نام سے ایک مذہبی مدرسہ قائم کر دیا۔ اس مدرسہ کو قائم کرنے میں مولانا قاسم صاحب کے علاوہ ان کے پرانے ساتھی حاجی رشید احمد صاحب گنگوہی کا جو غدر میں حصہ لینے کے جرم میں پھانسی پاتے پاتے بچے تھے، خاص ہاتھ تھا، ان کے علاوہ مولانا مہتاب علی صاحب اور ان کے بھائی مولانا ذوالفقار علی صاحب نے بھی اس کام میں پوری مدد کی تھی۔

مولانا قاسم صاحب نے جب یہ مدرسہ قائم کیا تب نہ انکے پاس پیسہ تھا اور نہ کوئی پیسے والا مددگار ہی تھا۔ عالم لوگوں کا حال یہ تھا کہ وہ ان سے باتیں کرتے بھی ڈرتے تھے پھر مدد کوں کرتا؟ مدرسہ کے سب سے پہلے طالب علم مولانا محمود حسن تھے جو آگے چل کر مولانا صاحب کے سچے جانشین

اور ولی اللہی جماعت کے چھٹے امام بنے۔

شروع میں درختوں کے سایہ میں پڑھائی ہوئی۔ اس وقت کون یہ جانتا تھا کہ یہ جو دو چار لڑکے ایک بوڑھے سے مولوی کے آگے بیٹھے ہوئے کلام پاک ہل ہل کر پڑھ رہے ہیں اور یہ مدرسہ جس میں دھوپ اور بارش سے بچاؤ کے لئے ایک چھت تک نہیں ہر کچھ برسوں کے بعد ہی ملک کی آزادی کے سپاہیوں کی ایک خاص چھاؤنی اور نہ صرف ہندستان بلکہ دنیا بھر کے اسلامی مدرسوں میں ایک خاص مدرسہ بن جائے گا۔

اس کے کچھ دن بعد ہی سرسید احمد صاحب نے علی گڑھ میں مسلم نوجوانوں کو انگریزی تعلیم دینے کے لئے ایک کالج کھولنا طے کیا۔ اس میں پڑھانے کے لئے ولایت سے انگریز پروفیسر بلائے گئے۔ سرسید احمد صاحب کی خواہش تھی کہ کالج کی اس تحریک میں مولانا قاسم صاحب بھی شریک ہو جائیں مگر قاسم صاحب نے اس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ اس بارے میں سرسید احمد صاحب اور ان کے ساتھیوں و مولانا قاسم صاحب میں جو لمبی خط و کتابت چلی وہ 'تقصیت العقائد' کے نام سے ایک کتاب کی شکل میں نکل چکی ہے۔ اس کتاب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا قاسم صاحب اُس زمانے میں بھی جب کسی مسلمان مولوی کیلئے انگریزوں کی عملداری کی نکتہ چینی کرنا بھی کالے پانی کی سزا کو نوٹا دینا تھا، کتنی نڈرتا سے اپنے دو چار اور عقیدے کو ظاہر کر سکتے تھے۔

اس زمانہ میں مولانا قاسم صاحب اور ان کے ساتھیوں

کے غلات کافی غلط فہمیاں پھیلانی گئیں۔ انگریزی سلطنت کی طرف سے ان لوگوں کو ایک عرصہ سے دوہابی، تو مشہور کر ہی دیا گیا تھا، ساتھ ہی ساتھ ان کو رجعت پرست (پرتی کریا دادی)، کلیہ کے فقیر اور ملک و قوم کا دشمن اور انگریزوں کی سلطنت کا باغی بھی قرار دیا گیا۔ سچ بات یہ تھی کہ آخری الزام کے سوا باقی سب بالکل بے بنیاد تھے۔ اور آخری الزام پر تو ان کو خود بھی اعتراض نہیں تھا۔

مولانا قاسم صاحب اس پر چار سے ذرا بھی نہیں گھبرائے وہ جانتے تھے کہ جب کوئی قوم اس طرح کچل دی جاتی ہے تب اس کے خیالوں میں بڑی آنکھیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور بہت بار وہ اپنی بھلائی جاننے والوں ہی کی دشمن ہو جاتی ہیں۔ انھوں نے ان باتوں کی پرواہ نہ کی کہ چپ چاپ اپنا کام جاری رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیوبند کا یہ مدرسہ جو صرف تین چار طالب علموں سے شروع ہوا تھا دنوں دن ترقی کرتا گیا اور تمام ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کے اسلامی ملکوں سے بھاری تعداد میں طالب علم وہاں آنے لگے۔ جب اس طرح مدرسہ کی ترقی ہونے لگی اور اس کا اثر مسلمانوں پر بڑھتا گیا تو کچھ ایسے لوگ بھی جن کو ابھی تک مدرسہ کے پاس آنے میں بھی دہشت ہوتی تھی مدرسہ کے کام میں ہاتھ بٹلنے لگے۔ ان کی طرف سے یہ سوچاؤ بھی پیش کیا جانے لگا کہ اب مدرسہ کے لئے سرکاری مدد بھی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور اس طرح مدرسہ کی مالی حالت مضبوط بنادی جائے۔

مولانا قاسم صاحب نے ایسے لوگوں کی ہمدردی اور اُنکے

سو جھاڑوں کے خطروں کو بھٹ پہچان لیا۔ چونکہ مدرسہ کسی کے ذاتی اختیار میں نہیں تھا، اس لئے وہ مدرسہ کے کام میں کسی کو حصہ لینے سے روک تو نہیں سکتے تھے۔ لیکن وہ یہ بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ اس طرح یہ مدرسہ صرف لڑکوں کی کتابی تعلیم دینے والا ایک مدرسہ بن کر رہ جائے اور اپنے پیچھے (اصولوں کو بھول جائے)، اس خطبے سے مدرسہ کو بچانے کے لئے انھوں نے کچھ قاعدے بنائے۔ جو ان کے کرائنت کاری و چاروں کو بالکل صاف ظاہر کرتے ہیں۔ یہ قاعدے 'رسالہ القاسم'، ۱۳۴۷ ہجری کے دالعلوم نمبر میں شائع ہوئے تھے۔ اور اسی سے ان کا کچھ حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

۱۔ آزادی ضمیر (وچاروں کی آزادی) کے ساتھ موقع پر کلمہ الحق (سچائی) کا اعلان ہو۔ کوئی سنہری تمغوں (لایچ) اور مرتبانہ دباؤ (ٹبرپن کا دباؤ) یا سرپرستارانہ مراعات (رکشا کرنیوالوں کی طرف سے دی ہوئی رعایتیں) اس میں حاصل نہ ہوں (رکاوٹ نہ ڈالیں)۔

۲۔ اس کا تعلق عام مسلمانوں کے ساتھ زائد سے زائد ہو، تاکہ یہ تعلق خود بخود مسلمانوں میں ایک نظم (سنگھٹن) پیدا کر دے جو ان کو اسلام اور مسلمانوں کی شان پر قائم رکھنے میں معین (سہاگم) ہو۔

ان دونوں قاعدوں سے یہ صاف مطلب نکلتا ہے کہ مولانا قاسم صاحب کے نزدیک اس مدرسہ کی سب سے بڑی اہمیت صرف یہ تھی کہ اس کے ذریعہ تمام مسلمانوں میں اسی طرح سے

ایک سنگٹھن پیدا ہو سکے جس طرح شاہ ولی اللہ نے اپنے دلی کے مدرسے کے ذریعے پیدا کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کچھ بڑے بڑے رئیس اور فواب اپنے پیسہ کے بل پر اس مدرسہ پر بھا جائیں اور اس کے اصلی اصولوں کو کچل دیں۔ ان کے اس خیال کا دوسرا ثبوت اس وصیت سے ملتا ہے جو انھوں نے مرتے وقت کی تھی اپنی اس وصیت میں انھوں نے مدرسہ کے بابت لکھا تھا۔

۱۔ "اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی سبیل (ذریعہ) یقینی نہیں ہے تب تک یہ مدرسہ انتشار اللہ (اگر خدا نے چاہا) اسی طرح چلتا رہے گا اور اگر کوئی آمدنی یقینی ایسی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی ایرکا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف درجا جو سرمایہ رجوع اللہ ہے (پرہاتما کے نام پر پنچاوری) وہ ہاتھ سے جاتا رہے گا اور کارکنوں (کام کرنے والوں) میں نزاع (جھگڑا) پیدا ہو جائے گا، القصد (سارا نیش یہ ہے کہ) آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع (طرح) کی بے سروسامانی ملحوظ رہے (غریبی کا دھیان رکھا جائے) ۲۔ سرکار کی شرکت (شامل ہونا) دائرار (امیدوں) کی شرکت بھی زیادہ مضر (نقصان پہنچانے والی) معلوم ہوتی ہے۔

۳۔ تا مقدور (جہاں تک ہو سکے) ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب (برکت دینے والا) معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندے سے اُمید نامودی (نام کی اچھا) نہ ہو یا بجلہ (آخر کار) حسن نیت (اہل چندہ) چندہ دینے والوں کی (اچھی نیت) زیادہ پائنداری (مضبوطی) کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

یہ وصیت ایک ایسا کرانت کاری دستاویز ہی جس سے ہندستان کی اگلی پڑھیاں ہمیشہ ایک روشنی حاصل کرتی رہیں گی۔ اس کے ایک ایک لفظ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا قاسم صاحب کتنے بڑے انقلابی اور ملک کی آزادی کے کتنے بچے دیوانے تھے۔ انھیں صرف چاہ تھی تو یہ کہ کسی طرح ان کی قوم پھر سے سنگٹھت ہو کر آزادی کے میدان میں اکٹھی ہو۔ ~~سنگٹھت~~ سنگٹھت یعنی اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں تک وہ برابر اسی کام میں لگے رہے،

مولانا قاسم صاحب نائوت ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے ان کے والد کا نام مولانا اسد علی تھا۔ انھوں نے حاجی امداد اللہ صاحب اور مفتی صدر الدین صاحب سے تعلیم حاصل کی تھی۔ مفتی صدر الدین اپنے زمانے کے ایک بہت بڑے عالم اور ولی اللہی جماعت کے دوسرے امام شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگردوں میں سے تھے۔ مفتی صاحب کے ایک دوسرے مشہور شاگرد مولانا ابوالکلام آزاد کے والد شیخ محمد خیر الدین صاحب تھے۔ ان کے علاوہ مولانا قاسم صاحب نے کچھ دنوں تک مولانا ملوک علی صاحب سے بھی پڑھا تھا۔

ولی اللہی جماعت کے اماموں میں مولانا قاسم صاحب اسلئے ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں کہ ایک طرح سے اس سنگٹھن کی بنیاد ان کو پھر سے جمائی پڑی اور وہ بھی اس حالت میں جبکہ ظلم کا طوفان جاری تھا۔ وہ ایک عجیب مہمت کے آدمی تھے جو بالکل ناامیدیوں کے اندھیرے میں بھی روشنی کی کوئی نہ کوئی کرن پیدا کر لیتے تھے۔ ~~سنگٹھت~~ سنگٹھت کے بعد لازماً

میں انگریزی عملداری کے خلاف ایک سنگٹھن بنائے رکھنا ان کا ہی کام تھا۔ وہ سب سے اوپر ملک کی آزادی کو جگہ دیتے تھے اور اس کے لئے سب کچھ قربان کر سکتے تھے۔

سلسلہ ان کی موت کے وقت دلی الہی جماعت کے سنگٹھن کی نو پھر سے کافی جم چکی تھی۔ اس کے لئے اب ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو ان کے بعد اس کام کو سنبھالے۔ مولانا قاسم صاحب کی نگاہ تو اس سلسلہ میں دارالعلوم کے سب سے پہلے و دیار تھی مولانا محمود احسن پر تھی جو اپنی تعلیم پوری کر کے مدرسہ دیوبند میں ہی ایک مدرس ہو گئے تھے لیکن ابھی ان کی عمر تھوڑی ہی تھی اس لئے کچھ دنوں کے لئے یہ بوجھ حاجی رشید احمد صاحب گنگوہی نے سنبھالا، رشید احمد صاحب ایسے بے دھڑک آدمی تھے کہ جب مولانا سعد الدین صاحب کاشمیری اور مولانا امان اللہ صاحب نے ان سے ہندستان کے دارالحرب ہونے کی بابت پوچھا تو انھوں نے یہ فتویٰ دے دیا کہ ہندستان دارالحرب ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ انگریزوں سے لڑائی جاری ہے اور ہر ایک مسلمان کا یہ مذہبی فرض ہے کہ اس لڑائی میں پورا حصہ لے۔

حاجی رشید احمد صاحب سلسلہ ۱۹۰۵ء تک زندہ رہے۔ ان کے بعد مولانا محمود احسن صاحب نے دلی الہی جماعت کی امامت کا بوجھ سنبھالا۔

حاجی شہید احمد گنگوہی

۱۷۷۷ء میں ولی اللہی جماعت کے پانچویں امام مولانا محمد قاسم صاحب کا انتقال ہو جانے پر جب اس سنگٹھن کو ایک نئے نیتا کی ضرورت ہوئی تو سب کی نظر مولانا محمود الحسن پر پڑی۔ مولانا محمود الحسن ولی اللہی جماعت کے شیخ، مرکز مدرسہ دیوبند کے پہلے وڈیارتھی تھے۔ ولی اللہی سنگٹھن کے اصول اور ارادوں کی پوری پوری تعلیم ان کو خاص طریقے پر، مولانا قاسم صاحب نے دی تھی۔ اس تعلیم کی ہی بدولت مولانا محمود الحسن صاحب نے اپنی پڑھائی کے زمانے سے ہی ملک کی آزادی کے لئے تجویزیں سوچنا اور ان پر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اپنی دوراندیشی، اندون اور پاک صاف چال چلن کی وجہ سے اپنے حلقے میں وہ بہت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اس لئے اُن کو امام بنانے اور ماننے میں انکار کس کو ہوتا؟ لیکن وہ زمانہ بہت نازک تھا۔ ۱۷۷۷ء کی لڑائی کی ناکامیابی اور اس کے بعد ہونے والے بھیانک فطلوں نے بڑوں بڑوں کے حوصلے پست کر دیے تھے۔ خاص کر مسلمانوں میں تو لوگ سیاست تو کیا مذہبی باتوں کی چرچا کرنے میں بھی ڈرتے تھے۔ اس حالت سے فائدہ اٹھا کر کچھ موقعہ پرستوں نے اسلام کے نام پر نئی نئی باتوں کو گڑھنا اور پھیلا نا شروع کر دیا تھا، یہاں تک کہ انگریز اور انگریزی

راج کے لئے وفاداری بھی اسلام کے اصولوں میں شریک
کر لی گئی تھی۔

وہ حالت مجبور کرتی تھی کہ اس وقت ولی اللہی جماعت کی
کمان کسی ایسے آدمی کے ہاتھ میں ہو، جس کو اس سنگٹھن سے
باہر کے بھی مسلمان جانتے اور مانتے ہوں اور جس کی رائے و فیصلے
کی تمام ہندستان کے مسلمانوں میں وقعت ہو، اور ساتھ ہی ساتھ
جس میں ملک کی آزادی کے لئے سچی تڑپ ہو اور جو مسلمانوں
میں انگریزوں کی وفاداری کا پرچار کرنے والوں کا ہمت کے
ساتھ مقابلہ کر سکے۔

ان تمام باتوں کو دھیان میں رکھ کر فیصلہ کیا گیا کہ ابھی کچھ
دنوں تک حاجی رشید احمد صاحب گنگوہی پر امامت کا یہ بوجھ
ڈالا جائے۔ حاجی رشید احمد صاحب گنگوہی ضلع سہارنپور کے
رہنے والے تھے۔ ان کی پوری عمر ہی ولی اللہی سنگٹھن کے
اصولوں کو سمجھنے اور اُن پر عمل کرنے میں بیتی تھی۔ اس کی وجہ
یہ تھی کہ گنگوہی صاحب کے والد جناب ہدایت اللہ صاحب انصاری
ایک سچے اور دین دار مسلمان تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میرا بیٹا
بڑا ہو کر ملک اور قوم کی خدمت کرے۔ اس لئے اُنھوں نے
گنگوہی صاحب کو بہت چھوٹی عمر میں ہی پڑھنے کیلئے دہلی بھیج دیا
تھا، جہاں وہ ولی اللہی سنگٹھن کے خاص نیتا مملوک علی صاحب
سے پڑھنے لگے اور مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ اُس زمانے کی سیاست
اور انگریزوں کی راج کا جی چال بازی کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے

تھے۔ اسی زمانے میں اُن کی جان پہچان مولانا محمد قاسم صاحب سے ہوئی، جو اسی مدرسے میں پڑھتے تھے اور رشید احمد صاحب کی طرح اپنے تیز ذہن کے لئے مدرسہ بھر میں مشہور تھے۔

اس مدرسہ کی تعلیم کا رشید احمد صاحب اور مولانا قاسم صاحب پر بہت گہرا اثر پڑا اور پڑھائی سے فارغ ہونے سے پہلے ہی دونوں نے ملک کی آزادی کے لئے کام کرنا شروع کر دیا۔ اس زمانے میں دہلی کا یہ مدرسہ ملک بھر کے انقلابیوں کا ایک خاص مرکز بنا ہوا تھا۔ انقلابیوں کے سب سے بڑے नेता حاجی امداد اللہ صاحب تھے جو رشید احمد صاحب و مولانا قاسم صاحب کے بھی استاد رہ چکے تھے۔ حاجی امداد اللہ صاحب چاہتے تھے کہ دلی اللہی سنگٹھن کو جلدی سے جلدی انگریزوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دینا چاہئے۔ اس کے لئے انھوں نے ایک جنگی کمیٹی بھی بنائی تھی، جس میں حاجی امداد اللہ صاحب کے علاوہ مولانا عبدالغنی، مولانا محمد یعقوب، رشید احمد صاحب اور مولانا قاسم صاحب بھی تھے۔ کچھ دنوں کے بعد جب حاجی امداد اللہ صاحب کو دلی اللہی جماعت کا چوتھا امام چنا گیا، تو یہی چار آدمی اُن کے وزیر مقرر کئے گئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے قاسم صاحب کی طرح حاجی رشید احمد صاحب نے بھی کتنی جلدی دلی اللہی سنگٹھن میں اپنے لئے یقین پیدا کر لیا تھا۔

اس کے بعد کچھ دنوں تک رشید احمد صاحب جگہ جگہ گھوم کر عام جنتا میں بیداری پیدا کرتے رہے۔ ان کو مذہبی

باتوں کی بڑی گہری جانکاری تھی۔ حدیث میں تو اُن کا لوہا بڑے بڑے عالم بھی مانتے تھے۔ ان کی عملی زندگی بھی بڑی پاک صاف تھی۔ نہایت سادگی کا رہن سہن سب سے میٹھا برتاؤ غریب و امیر سب کو ایک نظر سے دیکھنا اور ملک کے کام سے جو وقت بچے اُسے خدا کی یاد میں لگانا یہ سب ایسی باتیں تھیں جو اُن کی جان پہچان میں آنے والے ہر ایک انسان پر گہرا اثر ڈالتی تھیں۔ اسی سے جب وہ ملک کا دکھ درد بیان کرتے تھے تو سننے والوں پر پورا پورا اثر پڑتا تھا اور اُن کے دلوں میں آزادی کے لئے کچھ کرنے کی خواہش پیدا ہونے لگتی تھی۔ اس طہرح رشید احمد صاحب نے اپنے پرچار سے ہزاروں آدمیوں کو آزادی کی لڑائی کا سپاہی بنادیا۔ دھیرے دھیرے ۱۹۴۷ء میں وہ زمانہ بھی آگیا، جس کا اتنے دنوں سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ لیکن دلی الٹی سنگٹھن میں اس وقت کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اس انقلاب میں حصہ لینے کے خلاف تھے۔ اُن کی دلیل یہ تھی کہ یہ انقلاب اُن لوگوں کی طرف سے شروع کیا گیا ہے جو ملک میں کسی ایک آدمی کی بادشاہت چاہتے ہیں جبکہ شاہ دلی بہر صاحب پر جانتے بھرتے یعنی جمہوریت کی حکومت چاہتے تھے اس لئے اُس لڑائی میں حصہ لینا اپنے اصولوں سے گزرا ہے۔

اس دلیل کے خلاف حاجی امداد اللہ صاحب کا یہ کہنا تھا کہ ہم جمہوریت کے آج بھی حامی ہیں اور ہمیشہ رہیں گے، لیکن انگریزوں کو ملک سے باہر نکالنے کے لئے ہمیں اس انقلاب میں

پوری طاقت سے حصہ لینا چاہئے۔ چونکہ جب تک انگریز یہاں پر موجود ہو، تب تک نہ یہاں جمہوریت ہی قائم ہو سکتی ہو اور نہ شاہ ولی اللہ صاحب کے دوسرے اُصولوں کو ہی عمل میں لایا جاسکتا ہو۔ اعتراض کرنے والوں کو حاجی امداد اللہ صاحب کے اس جواب سے تسلی نہیں ہوئی، کیونکہ اُن میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جو لڑائی کی مصیبتیں سہنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ان لوگوں نے اس دلیل کے بہانے اُن مصیبتوں سے اپنا بچاؤ کر لیا اور ولی اللہ سنگٹھن سے الگ ہو گئے۔ حاجی رشید احمد صاحب بھی چاہتے تو اس وقت اپنا بچاؤ کر سکتے تھے، لیکن وہ اپنے دوست اور ساتھی مولانا قاسم صاحب کی طرح اپنی جگہ پر اڑک رہے اور انھوں نے آزادی کی اس لڑائی میں عملی حصہ لینا شروع کر دیا۔ اپنے استاد اور امام حاجی امداد اللہ صاحب کے ساتھ وہ بھی شافعی کے مورچے پر انگریزی فوجوں کے دانت کھینٹے کرتے رہے، اور تب تک لڑتے رہے جب تک کہ وہ لڑائی میں گھائل ہو جانے کی وجہ سے پکڑ نہیں لئے گئے۔

جیل خانے میں رشید احمد صاحب کو بڑی بڑی سخت تکلیفیں سہنی پڑیں۔ اس وقت لڑائی میں ہزاروں قیدی انگریزوں کے پاس تھے، جن کے کھانے پینے کا انتظام اُس وقت کی حالت میں نہ تو ہو ہی سکتا تھا، اور نہ انگریزوں کو اُس کی پروا ہی تھی۔ ان قیدیوں کے مقدمے بڑی جلدی جلدی نبٹائے جا رہے تھے۔ زیادہ تر لوگوں کو پھانسی پر

چڑھا کر ٹھکانے لگایا جا رہا تھا۔ رشید احمد صاحب بھی اس بات کو جانتے تھے کہ مجھے پھانسی کی ہی سزا ملے گی۔ کیونکہ اُن کے جسم پر گولی کا نشان اس بات کا صاف ثبوت تھا کہ انھوں نے اس جنگ میں حصہ لیا ہے۔ پھر بھی نہ اُن کوئی فکر تھی اور نہ کوئی افسوس۔ اُنھوں نے تو جس دن اس راہ میں قدم رکھا تھا، اُسی دن اس نتیجے کو جان لیا تھا۔ افسوس تو اُن کو صرف یہ تھا کہ آزادی کی وہ لڑائی ہندوستانوں کی آپسی پھوٹ کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی اور فکر بھی اُن کو صرف یہ تھی کہ کسی طرح ولی اللہی سنگٹھن کے کچھ ایسے خاص نیتا انگریزوں کے پنجوں سے بچ جائیں جو اس کے بعد بھی ولی اللہی تحریک کو چلاتے رہیں اور آزادی کے جھنڈے کو ادبچا اٹھائے رکھیں۔

کہا جاتا ہے کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے رشید احمد صاحب کے ساتھ ہی یہی ہوا۔ اُن کے مقدمے کا نمبر آنے سے پہلے ہی عام معافی کا اعلان ہو گیا اس اعلان کے مطابق رشید احمد صاحب بھی رہا ہوئے۔ جیل سے نکلنے ہی اُنھوں نے پھر اپنا پرانا کام شروع کر دیا۔ سب سے پہلے انھوں نے یہ پتہ لگایا کہ ولی اللہی سنگٹھن کے کون کون سے نیتا پھانسی کے تختے کی نظر ہو گئے اور کون کون سے بچ سکے ہیں۔ ان کو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ سنگٹھن کے سب سے بڑے نیتا حاجی امداد احمد صاحب صحیح سلامت مکہ پہنچ گئے ہیں اور

مولانا قاسم صاحب بھی پکڑے نہیں جاسکے ہیں۔
 اس کے بعد حاجی رشید احمد صاحب فوراً مولانا قاسم صاحب
 سے ملے اور اس بات پر غور کرنا شروع کیا کہ اب پھر سے
 آزادی کی لڑائی کس طرح شروع کی جائے۔ کچھ ہی دنوں
 میں وہ حاجی امداد اللہ صاحب سے بھی خط و کتابت کرنے
 میں سہل ہو گئے اور اب وہاں سے باقاعدہ صلاح مشورہ
 ملنے لگا۔ اسی صلاح کے مطابق دلی اللہ سنگھن پھر سے
 قائم کیا گیا اور اُس کے سب سے بڑے نیتا مولانا قاسم چنے
 گئے۔ اس کے بعد ۱۸۶۷ء میں دیوبند کا مدرسہ بھی قائم
 کر دیا گیا۔ اُس وقت یہ مدرسہ قائم کر لینا بھی کوئی آسان
 کام نہیں تھا، اور خاص طور پر کسی ایسے آدمی کا تو اس طرح
 کے کاموں میں حصہ لینا بہت ہی خطرناک تھا۔ جو بناوٹ
 کے الزام میں گرفتار ہو چکا ہو۔ لیکن رشید احمد صاحب نے کبھی ان
 باتوں کی پرواہ نہیں کی اور نہایت نڈرتا سے ان تمام کاموں
 میں آگے بڑھ کر حصہ لیتے رہے۔

دیوبند کا مدرسہ قائم ہو جانے کے بعد جب کچھ لوگوں نے یہ
 کوشش کی کہ دیوبند کا مدرسہ انگریز سرکار سے کچھ روپے پیسے کی
 مدد مانگے، تو مولانا قاسم صاحب کے ساتھ ساتھ رشید احمد صاحب
 نے بھی بات کی سخت مخالفت کی۔ رشید احمد صاحب تو دیوبند کے
 مدرسہ کو آزادی کے سپاہیوں کی ایک خالص چھاؤنی کی شکل میں
 دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لئے ایک بار انھوں نے یہ بھی رائے

ظاہر کی تھی کہ مدرسہ دیوبند میں فلسفے کی تعلیم دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یعنی وہ چاہتے تھے کہ نوجوانوں کو صرف دہری باتیں پڑھائی جا دیں جو اُن میں کیرکٹر اور مذہب و وطن کی محبت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہوں۔ وہ سپاہی چاہتے تھے عالم یا پنڈت نہیں، مطلب یہ کہ ولی اللہی سنگٹھن میں بھی اپنے زمانے میں وہ گرم دل کے لوگوں میں سے تھے۔

مولانا قاسم صاحب کا انتقال ہو جانے سے رشید احمد صاحب کو بہت گہرا دھچکا لگا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو بھائی کی طرح پیار کرتے تھے اور ملک کی آزادی کی لڑائی میں دونوں نے ساتھ ساتھ حصہ لیا تھا۔ دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے یقین اور عزت تھی اور خاص طور پر رشید احمد صاحب تو قاسم صاحب کو اپنا نیتا بھی مانتے تھے، اور اُن پر غیر معمولی بھروسہ رکھتے تھے۔ اسی لئے قاسم صاحب کے انتقال کی خبر پاتے ہی رشید احمد صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا تھا، ”سالار قافلہ چل بسا“ جو کسی دن خود بھی شہید ہوتا اور ہم کو بھی قربان کراتا“

رشید احمد صاحب کے ان لفظوں میں اُن کی آنکھوں کے نچلنے کتنے سنے بول رہے تھے۔

مولانا قاسم صاحب کے انتقال کے بعد رشید احمد صاحب سے جب امامت کا بوجھ سنبھالنے کو کہا گیا، تو وہ انکار نہ کر سکے۔ ان دنوں وہ گنگوہ میں رہتے تھے اور کبھی کبھی

دیوبند اگر مدرسے کے ودیارتھیوں کو درس (پاٹھ) دے جایا کرتے تھے، یا جو ودیارتھی مدرسے کی پڑھائی سے فارغ ہو کر مگلوہ پہنچتے تھے، اُن کو پڑھا دیا کرتے تھے۔ اس طرح سے اُنھوں نے قریب تین سو ودیارتھیوں کو تعلیم دی، جن میں سے کچھ نے آگے چل کر ہندستان کی آزادی کی لڑائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ایسے لوگوں میں ولی اللہی جامعہ کے چھٹے امام مولانا محمود الحسن صاحب، مشہور کرائستکاری مولوی عبید اللہ سندھی، موجودہ زمانے میں جمعیت کے بہت بڑے لیڈر مولانا حسین احمد صاحب مدنی کا نام مثال کے طور پر دیا جاسکتا ہے۔

رشید احمد صاحب کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح ہندستان کے مسلمان انگریزوں کی چال بازیوں سے بچے رہیں اور ہندستان میں آزادی کی لڑائی میں سب سے آگے بڑھ کر حصہ لیں۔ اسی وجہ سے اُن کو ایسے لوگوں سے بڑی چڑھ بھڑی جو انگریزی راج کی وفاداری کا مسلمانوں میں پرچار کرتے تھے، یا ایسے لوگوں کی راہ میں روڑے اٹھاتے تھے جو انگریزوں کی مخالفت کرتے تھے۔ بدقسمتی سے ایسے لوگوں میں سرسید احمد صاحب بھی تھے، جن کی شاندار شخصیت کے آگے بڑے بڑے سر جھکاتے تھے، لیکن حاجی رشید احمد صاحب سے اُن کی کبھی نہ پٹ سکی۔ یہیں تک نہیں، بلکہ کچھ برسوں کے بعد کانگریس کی مخالفت کرنے کے لئے جب سرسید صاحب نے 'انجمن اسلامیہ' قائم کی اور مسلمانوں کانگریس سے نکل کر اُس میں شریک ہونے کی دعوت دی، تو حاجی صاحب نے

ایک فتویٰ دیکھ یہ اعلان کیا تھا کہ مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونا چاہئے، انجمن اسلامیہ میں نہیں۔ یہاں پر یہ بات بھی صاف کر دینا ضروری ہے کہ نہ تو حاجی رشید احمد صاحب خود کانگریس میں شریک تھے اور نہ اُس وقت کی کانگریس کا پروگرام اُن جیسے گرم دل کے دیش بھگت کو پسند ہی آ سکتا تھا۔ پھر بھی اتنا تو صاف تھا ہی کہ کانگریس انگریزوں سے ہندوستانیوں کو کچھ حق دلوانا چاہتی تھی۔ سرسید احمد صاحب اور اُن کے ساتھی اس بات کو بھی ناپسند کرتے تھے اور صرف اس بات کا پرچار کرتے تھے کہ مسلمانوں کو اپنے ہر ایک کام سے یہ ظاہر کرنا چاہئے کہ وہ گمریزی راج کے پورے پورے وفادار ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ حاجی رشید احمد صاحب نے کانگریس کی حمایت کرنا ضروری سمجھا۔

اس کے کچھ دن بعد جب مولانا سعد الدین صاحب کانٹھیری در مولانا امان اللہ صاحب نے حاجی صاحب سے ہندستان کے دارالخبرہ دئے یا نہ ہونے کی بابت فیصلہ مانگا، تو حاجی صاحب نے ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل بہادری اور ہمت کے ساتھ یہ فتویٰ دیا کہ ہندستان 'دارالحرب' ہے۔ اس فتویٰ کا کچھ حصہ اس طرح سے تھا۔ 'اکنون حال ہند را خود غور فرمایند کہ اجرائے احکام کفار ساری دریں جا بچہ قوت و غلبہ ہست۔ اگر ادنیٰ کلمہ حکم کفر در مسجد جماعت ادا نمکنید، پنج مرد از امیر و غریب قتل کرد کہ ادائے آن نماید۔'

x x بہر حال تسلط کفار بر ہند دریں جا است کہ

درپنچ وقت کفار را بر در حرب زیادہ اڑیں نمود . دادائے مراسم اسلام
از مسلماناں محض بہ اجازت ایثا شست و از مسلمانان عزیز ترین
رعایا کسے نیست“

یعنی ”اب ہندستان کی حالت پر آپ خود غور کریں کہ اس ملک
میں عیسائی کافروں کے قانون اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ اگر ایک
ادنی سا کلکٹر بھی یہ حکم کر دے کہ مسجدوں میں اکٹھے ہو کر نماز نہ پڑھی
جلے، تو پھر کسی امیر غریب کی یہ ہمت نہیں پڑ سکتی کہ وہ مسجد
میں نماز پڑھ سکے۔

x x بہر حال ہندستان پر کافروں کا اختیار اس درجے تک
بڑھا ہوا ہے کہ کسی وقت بھی کسی دارالحرب، پر اس سے زیادہ کافروں
کا اختیار نہیں ہوتا۔ یہاں پر جو اپنے مذہبی کام مسلمان کرتے ہیں، وہ صرف
کافروں کی اجازت سے۔ مسلمان یہاں کی سب سے زیادہ دہمی رعایا ہے؛
یہ فتویٰ حاجی رشید احمد صاحب نے اُس زمانے میں دیا تھا، جب
سوراج کا نام لینے پر لوگوں کو لمبی لمبی سزائیں دی جاتی تھیں اور کچھ
نوجوانوں کو صرف اس لئے کالے پانی کی سزا دی گئی تھی کہ اُن کی گھسی
نگھوں سے ملک کو آزاد کرنے کا جذبہ ابھرتا تھا۔

اسی طرح حاجی رشید احمد صاحب ہمیشہ یہ کوشش کرتے رہے
کہ ہندستان کے مسلمان آزادی کی لڑائی میں پورے طور سے حصہ لیتے
رہیں اور اس کے لئے اگر غیر مسلمانوں کو بھی ساتھ لینا پڑے، تو اُن کو
بھی پناہی کے ساتھ میں لیں۔ وہ سلسلہ جیسی فضا ایک بار پھر ملک میں
دکھنا چاہتے تھے، اگر نیکل کا ہندستان میں رہنا ہر وقت اُن کے دل

میں کانٹے کی طرح چھبھتا تھا۔ اُن کی خواہش تھی کہ وہ ملک کی آزادی کے لئے لڑتے ہوئے ہی شہید ہوں، جب بھی کوئی ایسا موقع آیا، اُنھوں نے کبھی اپنا پاؤں پیچھے نہ ہٹایا اپنے ہر ایک شاگرد اور مرید کو بھی وہ یہی تعلیم دیتے تھے۔ جب وہ اپنے کچھ خاص شاگردوں کو اس میدان میں مارتے دیکھتے تھے، تو اُن کو بڑی تسلی اور خوشی ہوتی تھی۔

حاجی رشید احمد صاحب کا انتقال ۱۱ اگست ۱۹۰۵ء عیسوی دن شکر دار کو قریب ۸۹ برس کی عمر میں ہوا۔ اُس وقت تک ہندستان میں ایک نئی لہر پیدا ہو چکی تھی اور ملک جیسے نیتا نہایت صاف صاف لفظوں میں ہندستان کی آزادی کی مانگ کر رہے تھے، جس کے اثر میں آکر بہت سے نوجوانوں نے انگریزوں کے خلاف ہتھیاروں کو بھی استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس جُرم میں انگریزوں کا بہت سے نوجوانوں کو پھانسی پر بھی چڑھا چکی تھی، لیکن یہ آگ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اس وقت تک دلی الہی سنگھن بھی کافی مضبوط ہو چکا تھا اور حاجی رشید احمد صاحب کے خاص مرید مولانا محمود الحسن صاحب کی لیڈری میں ہندستان میں انگریزی حکومت کے خلاف لڑائی شروع کر دینے کی کافی زوردار تیاریاں کر رہا تھا۔

اس طرح حاجی رشید احمد صاحب کو اپنی زندگی میں ہی اپنے مشن کی کامیابی دیکھنا نصیب ہو گیا تھا اور مرتے وقت اُن وہ پورا اطمینان تھا کہ اب ہندستان زیادہ دنوں تک غلام نہیں رکھا جائے گا۔

مولانا محمود الحسن

ولی اللہی جماعت کے چھٹے امام مولانا محمود الحسن صاحب نے جماعت کی باگ ڈور پوری طرح تو سنبھالنے میں حاجی رشید احمد صاحب گنگوہی کے مرنے کے بعد اپنے ہاتھ میں لی۔ اس تحریک میں کام کرنا انھوں نے مولانا قاسم صاحب کے سامنے شروع کر دیا تھا اور اُن کے کام کو دیکھ کر مولانا قاسم صاحب کو یقین ہو گیا تھا کہ ولی اللہی تحریک مولانا محمود الحسن صاحب کی لیڈری میں اچھی طرح پھیل پھول سکے گی۔

مولانا محمود الحسن صاحب کی پیدائش ۱۲۶۷ھ میں دیوبند میں ہوئی تھی۔ اُن کے باپ مولانا ذوالفقار علی حناں اور تاج مولانا مہتاب علی صاحب ولی اللہی تحریک کے پُرانے مددگار تھے اور اُن نے گئے آدیسویں میں سے تھے جن کی مدرسے ہی ۱۲۶۷ھ کے اُس زمانے میں مولانا قاسم صاحب اس مدرسے کو قائم کرنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ مدرسے کے سب سے پہلے دذیار تھی بھی مولانا محمود الحسن ہی تھے۔ کچھ ہی دنوں میں مولانا قاسم صاحب نے اپنے اس غیر معمولی شاگرد کی جمعی طاقت کو پہچان لیا اور مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ جماعت کے اصلی اصول اور اُس کے مقصد بھی اُنہیں سمجھا دئے۔ کتنی ہی راتیں مولانا محمود الحسن صاحب نے اُس

کہانی کو سننے میں بتا دیں جس کی ایک ایک گھٹنا شہیدوں کے خون کے ذکر سے گونج رہی تھی۔ اس طرح بچپن میں ہی اُن کے دل میں ملک کی آزادی کی لگن پیدا ہو گئی اور اُنھوں نے یہ ٹھان لیا کہ وہ اپنی زندگی کا ایک ایک پل اسی کام میں بتائیں گے۔

۹ جنوری ۱۹۴۷ء کو دیوبند مدرسے کے جن پانچ دوپارہتھیوں کے سرپر نفیلت کی پگڑی بندھی یعنی جنہیں ڈگریاں ملیں، اُن میں ایک وہ بھی تھے۔ اس کے بعد اُنھوں نے مدرسے میں ہی بنا تنخواہ پڑھانا شروع کر دیا۔ ۱۹۴۷ء میں صرف پچیس روپے ماہوار پر وہ مدرسے کے چوتھے مدرس ہوئے اور اُنھوں نے دیوبند کے دوپارہتھیوں میں اپنا کام شروع کر دیا۔

۱۹۴۷ء میں اُن کے اُستاد مولانا قاسم صاحب اچانک چل بسے۔ اس کا اُن پر گہرا اثر ہوا، مولانا قاسم صاحب اُن کو اپنے بیٹے کی طرح پیار کرتے تھے۔ اس کے ایک سال بعد اُنھوں نے دیوبند کے کچھ اُستادوں اور طالب علموں کو ملاکر 'مترۃ النبی' کے نام سے ایک سنگٹھن کی نیوڈالی۔ خوش منتهی سے ولی الہی جماعت کے چوتھے امام حاجی امداد اللہ اُس وقت تک مکہ میں زندہ تھے۔ مولانا محمود الحسن رج کے بہانے اُن کے پاس گئے اور اُن سے اپنے پروگرام کی بابت ہدایتیں حاصل کیں۔ اس کے بعد مولانا ہندستان واپس آ گئے۔

اُس وقت ہندستان میں پھر ایک نئی راج کا جی ہچل نظر آنے لگی تھی۔ برٹش حکومت بھی اُسے ٹھاڈینے کے

لئے پروے کی اوٹ سے آئے دن ایک نئی چال چل رہی تھی۔ حکومت کو سب سے بڑی گھبراہٹ یہ تھی کہ آزادی کی جو لگن ابھی تک مسلمانوں میں ہی زور پر تھی وہ اب ہندوؤں میں بھی پھیلتی جا رہی تھی۔ یہ لارڈ لٹن کا زمانہ تھا، جس سے زیادہ تنگ نظر اور ہندستان کے بھلے بڑے کو نہ سوچنے والا وائسرائے اب تک شاید کوئی دوسرا نہیں آیا۔ اُسی زمانے میں دکن کا وہ مشہور اکال پڑا، جس میں پچاس لاکھ سے زیادہ ہندستانی مکھیوں کی طرح مر گئے، لارڈ لٹن پر اس کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔ اُس نے ایک طرف تو افغانستان پر چڑھائی کر دی اور دوسری طرف دلی میں ایک شاندار دُبار کرنے کا سرانجام شروع کر دیا۔ بھوکوں مرتے ہندستانیوں کے زخموں پر یہ نہک بھڑکنا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف دکن میں اور دوسری طرف پنجاب میں انگریزی حکومت کے خلاف لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ تحریکیں جلد ہی دبا دی گئیں، لیکن اس بات کا ثبوت دے گئیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد بھی ہندستان میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو برٹش حکومت کے خلاف ہتھیارے کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔

حکومت نے اس جوش کو دبانے کے لئے ایک طرف کونسلین قائم کر کے کچھ معمولی سے حق ہندستانیوں کو دے دیے تو دوسری طرف پریس ایکٹ اور ہتھیار چھیننے کا قانون بنا کر لوگوں کو دباننا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک تیسری چال بیڑٹ ڈالنے کی تھی، جو پہلی دونوں چالوں سے بھی زیادہ کامیاب رہی اور آج تک جاری ہے۔ بڑا یہ ہوا کہ ملک کے کچھ بڑے بڑے

سمجھ دار اور اثر والے لوگ بھی حکومت کے اس جال میں پھنس گئے اور پھنستے رہے اور ملک کی آزادی کے اُس ننھے سے پودے کو جسے ایک طرف دیوبند کی جماعت اور دوسری طرف دکن بنگال و پنجاب میں اُٹھتی ہوئی اُمکیں پیچ رہی تھیں، نقصان پہنچاتے رہے۔

مولانا محمود احسن ان حالتوں میں بھی برابر اپنے کام میں لگے رہے اور 'ثمرۃ التریب' کے سنگٹھن کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتے رہے، پر وہ کوشش کچھ پھیل نہ لاسکی، اس کے بعد اپنے تھوڑے سے چنے ہوئے ساتھیوں کے سہارے وہ اپنے کام میں لگے رہے۔ اُس وقت اُن کا خیال تھا کہ چونکہ ہندوستانیوں سے ہتھیار پھین لے گئے ہیں اس لئے جب تک کوئی غیر ملکی حکومت ہماری مدد پر نہ ہو، تب تک آزادی کا جنگ شروع نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لئے اُن کی نظر کابل پر گئی۔ ہندستان اور افغانستان کی حدیں ملی ہونے کی وجہ سے وہیں سے مدد ملنا سب سے زیادہ آسان تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہندستان کی سرحد پر بسے ہوئے آزاد قبیلوں کی مدد حاصل کرنے کا خیال بھی اُن کے دل میں اُٹھا، کیونکہ وہیں ولی اللہی جماعت کی وہ دہری شاخ جو سلسلہ میں سید احمد بریلوی کے ساتھ ہندستان سے ہجرت کر کے سرحد پر چلی گئی تھی، ابھی تک اپنا کام کر رہی تھی۔ مولانا محمود احسن نے مدرسہ دیوبند کے اُن طالب علموں کے سہارے جو آزاد قبیلوں سے آئے تھے، اپنا تعلق وہیں سے قائم کیا اور وہ اُس میں کامیاب ہوئے۔ آزاد قبیلوں کے

علاقے کے ایک بڑے اثر والے سردار تریگ زئی کے حاجی صاحب سے اُن کی پرانی جان پہچان تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سید احمد علی کی آزادی کی لڑائی میں حاجی امداد اللہ صاحب آداد قبیلوں کی مدد لینے اور ولی اٹلی جماعت کی ان دونوں شاخوں کو ملائے کی جس کوشش میں ناکامیاب ہوئے تھے، زمانے کی ضرورتوں سے مولانا محمود الحسن اب اُس میں کامیاب ہوئے۔ اب ان آزاد قبیلوں کے دوت اور آدمی برابر اُن کے پاس آنے جانے لگے۔

افغانستان میں اُس وقت امیر حبیب اللہ کاراج تھا۔ مولانا نے فوراً ہی اُن سے اور اُن کے کچھ بڑے بڑے سرداروں اور بھائیوں سے لکھا پڑھی شروع کی۔ ان بھائیوں میں خاص شہزادہ نصر اللہ خاں تھے، جنہوں نے ۱۸۹۸ء میں انگلستان جاکر وہاں کی پارلیمنٹ کے ممبروں اور برٹش سرکار کے افسروں سے بڑے زور کے ساتھ کہا تھا کہ افغانستان کی حکومت میں انگریزوں کا جو دخل ہو وہ فوراً اٹھا لیا جائے۔ اُن کی بات اُس وقت نہیں مٹنی گئی، جس سے اُنہوں نے انگریزوں کی مخالفت میں 'جمعیت سیاسیہ' کے نام سے افغانستان میں ایک سنگٹھن بنانا شروع کر دیا۔ مولانا محمود الحسن نے اس 'جمعیت' سے بھی اپنا سمبندھ قائم کر لیا تھا اور اُن کے کچھ افغان شاگرد اُس میں بڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔

اس کے بعد اُنہوں نے پھر ہندستان میں اپنے سنگٹھن کو مضبوط کرنے کی طرف دھیان دیا۔ اس وقت تک ہندستان میں انگریزوں اور انگریزی راج کا اتنا ڈر نہیں رہ گیا

تھا۔ ساتھ ہی مولانا محمود احسن کو مولانا عبید اللہ سندھی و مولانا قاسم صاحب کے دھیوتے محمد میاں انصاری جیسے شاگرد بھی مل گئے تھے۔ مولانا کی سادہ اور محنت کی زندگی، سچائی، خدا پرستی نے کافی اثر پیدا کر لیا تھا اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری جیسے لوگ اُن کے مرید بن چکے تھے۔

سلسلہ کے آس پاس مولانا کی ہدایتوں کے مطابق اُن کے شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی نے مدرسہ دیوبند میں 'جمعیت الانصار' کے نام سے ایک نیا سنگٹھن قائم کیا، جس میں دیوبند کے مدرسے سے نکلے وڈیار تھی شریک تھے۔ سلسلہ میں دیوبند کے مدرسے کا جو شاندار کنوونکیشن ہوا اُس میں اس جماعت کے قائم ہونے کا اعلان کیا گیا اور اگلے سال اُس کا سالانہ جلسہ کرنے کا بھی اعلان ہوا۔ اسی اعلان کے مطابق 'جمعیت الانصار' کا پہلا جلسہ ۱۵-۱۶-۱۷ اپریل ۱۹۱۱ء کو مراد آباد میں ہوا، جس میں اس سنگٹھن کے اصولوں پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا محمود احسن کے گرد بھائی مولانا احمد حسن محدث امرہوی نے اپنی تقریر میں کہا تھا۔

”بعض نئی روشنی کے شیدائی (پریمی) کہتے ہیں کہ جمعیت الانصار اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی نقل ہے، لیکن یہ بات ہرگز صحیح نہیں۔ جمعیت الانصار کی تحریک اب سے تیس برس پہلے شروع ہو گئی تھی، اور اُس تحریک کے بانی مدرسہ عالیہ کے وہ طالب علم تھے، جو آج علوم (علموں)

کے سرچشمہ (دریا) ہیں اور آفتابِ فنون (بہنر کے سورج) ہیں۔ اور جن کی ذات برکات (برکت والی ذات) پر آج زمانہ جس قدر ناز کرے تھوڑا ہی۔ لیکن یہ تحریک اُس وقت زمانے کی ضرورتوں سے متعلق نہ تھی، اس لئے ٹک گئی اور آخر اس میں کلیہ (اصول) کی بنا پر کہ ضرورت ہر چیز کو اپنے آپ پیدا کر دیتی ہے، ۱۹۰۹ء سے اس انجمن کو دوبارہ زندہ کر کے 'جمعیت الانصار' نام رکھا گیا۔ جمعیت الانصار ہرگز کسی انجمن کی نقل نہیں ہے۔ اور نہ کسی ذاتی مقاصد (سختی فائدے) سے بحیثیت دنیاوی اس کا تعلق ہے، بلکہ اس کے مقصد وہ ضروری مقصد ہیں جن کی آج کل بہت ضرورت ہے۔

اس حوالے سے ظاہر ہے کہ جمعیت الانصار 'ثمرۃ التریب' کا

ہی دوسرا روپ تھی۔ ایک طرف مولانا محمود الحسن اپنے سنگٹھن کو مضبوط بناتے جا رہے تھے، دوسری طرف حکومت بھی خاموش نہیں بیٹھی تھی۔ مدرسے کے چلانے والوں نے انگریز سرکار سے روپیہ کی مدد لینے سے بار بار انکار کیا تھا، مدرسے کے بانی مولانا قاسم صاحب و ان کے ساتھیوں کی زندگی کے حالات سرکار کو معلوم تھے۔ حکومت کے دل میں کافی ڈر پیدا ہو چکا تھا۔ خواہ میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی تجویز پر مدرسہ دیوبند کی انتظامیہ کمیٹی نے یہ طے کیا کہ ہر سال مدرسہ دیوبند کے کچھ طالب علم انگریزی

بڑھنے کے لئے علی گڑھ کالج جائیں اور علی گڑھ کالج کے کچھ طالب علم عربی کی تعلیم کے لئے مدرسہ دیوبند بھیجے جائیں۔ اس تجویز کے مطابق علی گڑھ کالج کے ودیارتھیوں کا جو پہلا جہا دیوبند آیا، اُسی کے ایک ودیارتھی انیس احمد کو برکارنے اپنی طرف پھوڑا اور وہ مولانا محمود الحسن کی تمام پہچانوں کی رپورٹ حکومت تک پہنچانے لگا۔ اُن دنوں مولانا اور اُن کے ساتھیوں کی خاص بیٹھکیں ایک تہ خانے میں ہوا کرتی تھیں، جس میں سرحد و کابل سے آئے ہوئے وہ لوگ بھی، جو مولانا کے مشن میں شریک تھے، شامل ہوا کرتے تھے۔ انیس احمد کو اس تہ خانے کی بیٹھکیوں کا حال تو نہیں معلوم ہوتا تھا، لیکن وہ اُن آئے جانے والوں کے نوٹوں سے حکومت تک پہنچاتے رہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کو حالانکہ مولانا کے اصلی بھید نہیں معلوم ہو سکے، پھر بھی وہ اتنا تو جان ہی گئی کہ مولانا کوئی ایک بہت بڑی سازش انگریزوں کے خلاف کھڑی کر رہے ہیں۔

کچھ دن بعد ہی ترمگ زئی کے حاجی صاحب نے سرحد پر مدرسے قائم کرنے شروع کیے۔ ولی اللہی جماعت کا اپنے اصولوں کے پرچار کے لئے ایسے مدرسوں کا قائم کرنا ایک پُرانا طریقہ تھا۔ ترمگ زئی کے حاجی صاحب کو اپنے اس کام میں اپنے گاؤں کے پاس میں ہی ایک سچے اور محنتی نوجوان کی مدد ملی تھی جو بعد میں بہت مشہور سیاسی لیڈر ہوا۔ یہ نوجوان حسام

عبدالغفار خاں صاحب تھے، جو آج سرحدی گاندھی کے نام سے تمام ہندستان میں مشہور ہیں۔ لیکن اس بات کو اسے گنے لوگ ہی جانتے ہیں کہ اُن کو سیاست کے میدان میں کھینچنے والے ولی اللہی جماعت کے ہی ایک ممبر ترنگ زئی کے حاجی صاحب تھے۔

سرکار نے فوراً سرحد کے یہ مدرسے جبراً بند کر دئے اور حاجی صاحب پر کچھ پابندیاں لگانے یا اُن کو قید کرنے کی بھی کوشش کی۔ اس پر مولانا کی ہدایت کے مطابق حاجی صاحب آزاد قبیلوں میں چلے گئے۔ اُنھوں نے وہاں پٹھانوں کا سنگٹھن شروع کر دیا۔ کچھ دن بعد مولانا محمود احسن نے مدرسہ دیوبند کے ایک پُرانے دوپارہتی مولانا سیف الرحمان کو آزاد قبیلوں میں سنگٹھن کے لئے ترنگ زئی کے حاجی صاحب کے پاس بھیجا۔ مولانا سیف الرحمان پشاور کے نزدیک کے ہی رہنے والے تھے اور مدرسہ دیوبند میں اُنھوں نے تعلیم پائی تھی۔ کچھ دن ٹونک میں پڑھا کر وہ دلی میں فتح پوری مدرسے کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے تھے۔ ترنگ زئی کے حاجی صاحب کے پاس پہنچ کر اُنھوں نے پٹھانوں کا کافی سنگٹھن کیا۔ اس کے بعد وہ اسی کام سے کابل چلے گئے۔ پر بعد میں سرکاری دباؤ اور چپکالوں نے اُنھیں اس فیصلے پر خطرناک راستے سے الگ کر دیا۔

مولانا محمود احسن صاحب کا پروگرام یہ تھا کہ کابل سے لیکر ہندستان کے ٹھیکہ دوسرے کوئے تک ایک سنگٹھن پھیل جائے۔ وہ سنگٹھن جب پورا ہو جائے تو کابل اور آزاد قبیلوں کی ایک فوج ہندستان پر

حکم کرے۔ ملک کے بھیتے کا سنگٹھن اس وقت ملک کے بھیتے سے لڑائی چھیڑ دے اور اس طرح انگریزی حکومت کو اکھاڑ پھینکا جائے۔

کچھ دنوں بعد جب ترکی اور بلکان ریاستوں میں لڑائی چھڑی تو مولانا اور اُن کی پارٹی نے ترکی کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی فیصلے کے مطابق ڈاکٹر انصاری صاحب ایک ڈاکٹری مشن لے کر ترکی گئے۔ اس کے کچھ دن بعد ۱۹۱۴ء میں یورپین جنگ کا اعلان ہو گیا۔ مولانا نے فوراً طے کر لیا کہ برٹش حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا یہ سب سے اچھا موقع ہو۔ اُنہوں نے اس کے لئے اپنے سنگٹھن کی کڑیاں اور بھی مضبوط کرنی شروع کر دیں۔ اس وقت تک وہ دلی میں بھی 'نظارۃ المعارف' کے نام سے ایک مدرسہ قائم کر چکے تھے، جو دراصل دلی اللہی جماعت کے کمرانت کاری سنگٹھن کی ایک شاخ تھا۔ اس مدرسے کا تمام بوجھ مولانا محمود الحسن صاحب کے خاص شاگرد اور اُن کی سیاست کے راہزواں مولانا عبید اللہ سندھی پر تھا اور مدرسے کی مدد ڈاکٹر انصاری حکیم اجل خاں وغیرہ بھی کرتے رہتے تھے، جو مولانا کے مرید اور اُن کے دوستوں میں سے تھے۔

اسی زمانے میں ہندستان کے ایک دوسرے مولوی عہد الحق حقانی نے یہ فتویٰ دیا کہ ترکی کے خلاف انگریزوں کی مدد کرنا جائز ہے۔ اس فتویٰ پر کچھ اور مولویوں کے بھی دستخط تھے۔ کچھ دن بعد یہ فتویٰ دستخطوں کے لئے مولانا محمود الحسن صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ مولانا محمود الحسن ٹھنڈے مزاج کے تھے اور اپنے سیاسی خیال سے اس لئے خاص

شاگردوں کے عام طور پر ظاہر نہیں کیا کرتے تھے، لیکن جب یہ فتویٰ ایک عام جلسے میں اُن کے سامنے پیش کیا گیا، قاضیوں نے اپنے مزاج کے خلاف بڑے سخت لفظوں میں اُس فتوے کی بڑائی کی اور اُسے اٹھا کر پھینک دیا۔ اُس زمانے میں یہ ایک عام افواہ پھیلائی گئی تھی کہ انگریز حکومت ہندستان میں اپنی ذرا بھی مخالفت برداشت نہیں کرے گی اور جو بھی اُس کے راستے میں آوے گا اُسے پوری طرح کچل دے گی۔ مولانا جانتے تھے کہ اس فتوے کے بارے میں چُپ رہنا حکومت کی دھکی کو منظور کر لینا اور تمام ملک کے سامنے ڈر کی ایک بڑی مثال کھڑی کر دینی ہے، اس لئے انہوں نے تمام نظروں کو پہچانتے ہوئے بھی اُس کے بارے میں ایسا سخت رویہ اختیار کیا۔ ان کے اس برتاؤ سے اُن کے ساتھیوں میں بڑی سنسنی پھیل گئی اور لوگ یہ اُمید کرنے لگے کہ مولانا فوراً گرفتار کر لئے جائیں گے، لیکن اُس وقت حکومت کی ہمت اُن پر اتنے ڈلنے کی نہ ہوئی، حالانکہ اس کے بعد مولانا کو حکومت کے ہاتھوں اس سے سیویں مئی زیادہ تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔

اگست ۱۹۱۵ء میں مولانا نے اپنے خاص شاگرد عبید اللہ سندھی کو کابل بھیجا۔ عبید اللہ سندھی نے لکھا ہے کہ مولانا نے جب اُن کو کابل جانے کا حکم دیا، تب کوئی خاص پروگرام انہیں نہیں دیا۔ کابل پہنچ کر اُن کو معلوم ہوا کہ مولانا نے پچھلے بیسویں برسوں سے وہاں میدان تیار کر لیا تھا۔ جب عبید اللہ سندھی جنرل نادر خاں سے ملے تب اُن کو یہ دیکھ کر

بہت حیرت ہوئی کہ جنرل تاور خاں اُن کی بابت پہلے سے بہت کچھ جانتے تھے۔ اس کے بعد کابل میں اس جماعت کے کارکنوں نے جو کچھ کیا، اُس کی ایک لمبی کہانی ہو۔ تھوڑے سے میں یہ کہا جاسکتا ہو کہ کابل کے تخت سے انگریزوں کے حمایتی امیر حبیب اللہ کو ہٹا کر اُن کی جگہ انگریزوں کے سخت مخالف امان اللہ خاں کو بٹھانے اور انگریزوں کے پنجوں سے افغانستان کو آزاد کرانے میں بہت بڑا ہاتھ مولانا محمود احسن اور اُن کے شاگردوں کا تھا۔ یہ ایک ایسی بات ہے، جسے لوگ بڑھاکر کسی ہوئی سمجھ سکتے ہیں، لیکن اب زمانہ آگیا ہے کہ اُس کے پوسٹ ٹبوت بھی پیش کئے جاسکتے ہیں۔

مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل بھیجنے کے ایک مہینہ بعد ۱۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو مولانا محمود احسن صاحب بھی اپنے کچھ خاص شاگردوں کے ساتھ جج کے ہاؤس پہلے دئے: حکومت کو لپٹے جاسوس انیس احمد کے ذریعے مولانا کی ان ہل چلوں کی باتیں معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ جب مولانا کو ہندستان سے باہر جاتے دیکھا، تو حکومت کا ماتھا ٹھنکا۔ مولانا کے بھائی پنچتے پنچتے دہان کے امیروں کو مولانا کی گرفتاری کا حکم بھیجا گیا۔ حکم کچھ دیر سے پہنچا۔ وہ اُس وقت ملا حبیب بیسیوں ہزار مسلمان مسند کے کنارے کھڑے اپنے اس امام کو بدلا کر رہے تھے۔ اس کے بعد جہان کے کپتان کو مولانا کی گرفتاری کا حکم دے دیا گیا۔ وہ بھی کسی وجہ سے عمل میں نہ آسکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا

مع اپنے ساتھیوں کے حجاز پہنچ گئے۔ وہیں وہ حجاز کے گورنر غالب پاشا سے ملے اور اُن سے آزاد قبیلوں کے لئے ایک خط حاصل کیا، جس میں ترکی سرکار کو مولانا کا مددگار بتایا گیا اور قبیلوں سے یہ اپیل کی گئی تھی کہ وہ انگریزوں کے خلاف منگھٹ ہو کر لڑائی چھیڑ دیں۔ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں اس خط کا ذکر غالب نامہ کے نام سے کیا گیا ہے۔

غالب پاشا کے اس خط کو مولانا کے ایک خاص شاگرد محمد میاں انصاری نے کچلے اور ہندستان ہوتے ہوئے آزاد قبیلوں میں وہ خط پہنچا کر کابل پہنچ گئے۔ اس کے بعد مولانا کمرہ اور مدینہ پہنچے۔ وہیں مولانا محمود الحسن کے ایک دوسرے شاگرد مولانا حسین احمد صاحب پہلے سے رہ رہے تھے۔ مولانا کو حسین احمد صاحب سے کافی مدد ملی۔

رہنے میں مولانا نے ترکی حکومت کے جنگی وزیر انور پاشا اور ایک دوسرے فوجی امیر جمال پاشا سے ملاقات کی۔ انور پاشا مولانا کی بابت پہلے سے سُن چکے تھے۔ انھوں نے مولانا کو پوری مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ”اصلی مدد تو آپ کے ملک کے ہی لوگ دے سکتے ہیں اور اس کے لئے ضروری یہ ہے کہ آپ غیر مسلمانوں کو بھی اپنے ساتھ لیں۔ انور پاشا کی ان باتوں کا مولانا بے گرا اثر پڑا۔ انھوں نے کابل میں کام کرنے والے اپنے ساتھیوں کو یہ مسند یا بھیجا کہ وہ غیر مسلمانوں کو خاص طریقے پر اپنی تحریک میں شریک کریں اور اُن کو ذمہ داری کی جگہیں

دے کر یہ اطمینان دلانے کی کوشش کریں کہ اس تحریک کا مطلب صرف ملک کی آزادی ہے، نہ کہ ہندستان پر پھر سے مسلمانوں کی حکومت قائم کرنا۔ اس سندیے کے مطابق راجا ہند پر تاپ کو ہندستان کی اُس عارضی سرکار کا پریسیڈنٹ بنایا گیا جو کابل میں مولانا عبید اللہ سندھی وغیرہ نے قائم کی تھی وہ اس طرح کی پہلی سرکار تھی، جس کی یاد نیتاجی سو بھاش پندرہ بوس نے جاپان، سیام اور برما میں آزاد ہند سرکار قائم کر کے بیسیوں برس بعد پھر سے تازہ کر دی۔

اسی وقت انور پاشا کی صلاح سے یہ بھی طے ہوا کہ مولانا محمود صاحب خود بھی آزاد قبیلوں میں پہنچیں۔ اس کا انتظام ہو ہی رہا تھا کہ مکہ کا حاکم شریف حسین انگریزوں سے مل گیا۔ اُس نے ترکی حکومت کے خلاف بغاوت کا جھنڈا کھسٹا کر دیا۔ مولانا اس کا نتیجہ جانتے تھے۔ اُنھوں نے مکہ سے نکل جانے کی کافی کوشش کی پر ناکام رہے اور سح اپنے ساتھیوں کے ۱۷ ستمبر ۱۹۱۴ کو گرفتار کر لئے گئے۔ اس کے بعد قریب چار سال تک وہ مالٹا کے فوجی قید خانے میں نظر بند رکھے گئے۔ ان چار سال میں اُن کو دُآن کے ساتھیوں کو جو سخت تکلیفیں اٹھانی پڑیں، اُن کو بیان کرنے کے لئے کئی موٹی موٹی جلدیں بھی ناکافی ہوں گی۔ شروع میں تو سبھی کو یقین تھا کہ پچاسنی دیدی جائے گی اور اسی یقین کے مطابق مولانا کے ایک ساتھی عزیز گل صاحب سرحدی اپنی گردن دبا دبا کر دیکھا کرتے تھے کہ پچاسنی کے

وقت کتنی تکلیف ہوتی ہو۔ بعد میں حکومت نے کسی مصلحت سے پھانسی تو نہ دی پر یہ چار سال کی نظر بندی پھانسی سے زیادہ تکلیف کی تھی۔ مولانا اور اُن کے ساتھیوں نے خوشی خوشی یہ سب سہا اور کبھی اپنے ماتھے پر ٹسکن بھی نہیں آنے دی۔ مولانا کے ایک ساتھی حکیم نصرت حسین صاحب کا تو مالٹا ہی میں انتقال بھی ہو گیا۔ آج ابھی مالٹا میں ملک کے اس دیش بھکت سپوت کی قبر ایک سنان جگہ میں بنی ہوئی ہو اور ”نے چراغے نے گلے“ اُس دن کا انتظار کر رہی ہو جب آزاد ہندستان اُس کی اہمیت سمجھے گا۔

مئی ۱۹۲۰ء کے آخری ہفتے میں مولانا محمود الحسن صاحب اس نظر بندی سے رہا ہو کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ بمبئی پہنچے۔ اُس وقت تک خلافت کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ حکومت کو ڈر تھا کہ مولانا بھی آکر کہیں اس میں شریک نہ ہو جائیں۔ اس لئے جہاز پر ہی خفیہ پولیس کے کچھ افسر اور ایک کوئی مولوی رحیم بخش صاحب مولانا سے ملے اور ان کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ بمبئی کے کسی استقبالیہ جلوس میں شریک نہ ہوں اور نہ خلافت سے اپنا کوئی سمبندھ دکھا دیں، بلکہ چپ چاپ دیوبند چلے جائیں۔

مولانا نے ان لوگوں کو کوئی جواب نہیں دیا۔ اُن کو خود جلوس وغیرہ میں شریک ہونا اچھا نہیں لگتا تھا۔ لیکن اس مشورہ میں جو اشارہ تھا، اُس کی وجہ سے اُنھوں نے خلافت کیٹی کو اپنا سواگت کرنے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد تو دیوبند تک ہر اسٹیشن پر اُن کا شاہی استقبال ہوا۔ اس

طرح انھوں نے حکومت کو یہ بتا دیا کہ چار سال کی غنڈہ کی ٹیکہ لگائیں ان کی صحت اور جسم پر بھلے ہی کتنا بھی اثر ڈال سکی ہوں، پر ان کی اُنگوں پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ ملک کی آزادی کی چاہ اب بھی اُسی طرح ان کے دل میں موجود ہوگی۔

دیوبند آکر مولانا محمود الحسن صاحب نے اپنے تمام خاص ساتھیوں کو اکٹھا کر کے حکومت کے خلاف لڑنے کا ایک پروگرام ان کے سامنے رکھا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ انگریزوں اور انگریزی حکومت کے خلاف ان کے دل میں جو نفرت ہو، وہ صرف اس وجہ سے نہ نہیں ہو کہ ذاتی طور پر ان کو ان کے ذریعے ٹیکہ لگائی پڑی ہو۔ یہ بات ثابت کرتی ہو کہ مولانا خود اپنی بابت بھی کتنی گہرائی کے ساتھ سوچا کرتے تھے۔

مولانا محمود الحسن نے یہ نیا پروگرام ایسا بنایا تھا، جس میں عام جتنا حصہ لے سکے۔ وہ اب تک یہ اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ صرف سیاسی سازشوں سے آزادی کی لڑائی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اسی سچائی کو ہندستان کے دوسرے کرانتی کاروں نے ۱۹۲۵-۲۶ء کے بعد سمجھا اور وہ بھی بم پستولوں کا سہارا چھوڑ کر جنتنا ایمنی کمان مزدوروں کا سنگٹھن کرنے لگے۔ مولانا محمود الحسن نے اس سچائی کو پندرہ برس پہلے سمجھ لیا تھا۔ یہ ان کی دوراندیشی کی ایک دوسری مثال ہوگی۔

غور بند کی کے ان چار برس میں مولانا کی محنت بالکل

گئی تھی۔ گٹھیا کا درد اُن کو دن رات پریشان کرتا تھا، ساتھ ہی دم دم پر پیشاب جانے کا رنگ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ مولانا آرام کریں، لیکن مولانا کو ایک پل کے لئے بھی چین نہیں تھا۔ وہ دن رات گھومتے رہتے تھے۔ اس کے کچھ دن پہلے 'جمعیت العلماء' کے نام سے ایک جماعت قائم کی جا چکی تھی، جو ملک کی آزادی کے لئے ایک کھلا پروگرام جتنا کے سامنے رکھنے کا مشن لے کر شروع ہوئی تھی۔ مولانا نے اس خیال کو بہت پسند کیا۔ وہ دن رات اس کے سنگٹھن کو مضبوط کرنے کی کوشش میں جڑے رہنے لگے۔ اس محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کو تپ دق ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے پھر یہ بتلایا کہ مولانا کا جسم تھوڑی سی بھی محنت برداشت نہیں کر سکتا، لیکن مولانا کو ایک پل بھی بیکار رکھونا گوارا نہیں تھا۔ دن رات بخار میں پھٹتے ہوئے وہ تجویزوں کے مسودے لکھنے و ساتھیوں کو ہدایتیں دینے میں جڑے رہتے تھے۔

اسی زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی کے کچھ آزاد خیال دُویا رتھیوں نے اُن سے اپنے جلسے کی صدارت کرنے کی درخواست کی۔ مولانا اس وقت پلنے جلنے سے بھی مجبور تھے۔ ڈولی میں لیٹ کر وہ اسٹیشن پہنچے۔ اسی حالت میں علی گڑھ تک کا سفر کیا۔ وہاں ہینچکر ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جلسے کی صدارت کی۔ یہ اُن کی آخری تقریر تھی، جس میں ملک کی آزادی کے لئے سب کچھ داؤں پر لگا دینے کی اپنی آغوشوں نے بڑے پُروردہ لفظوں میں کی تھی۔ یہ مجلس علی گڑھ کالج

کے آن و دیار بھٹیوں کا تھا ، جنہوں نے خلافت تحریک کے پروگرام کے مطابق نئی گڈھ یونیورسٹی اس لئے چھوڑ دی تھی ، کیونکہ وہ سرکاری مدد پر چلتی تھی۔ اسی وقت مولانا محمود الحسن صاحب کے ہاتھوں سے جامعہ ملیہ اسلامیہ ، مدرسے کی بھی یورکھی گئی جو آج بھی مدرسہ دیوبند کی طرح دلی میں قومی تعلیم کا ایک خاص مرکز ہے۔ اس کے ٹھیک ایک مہینے بعد ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو دلی میں ڈاکٹر انصاری صاحب کی کوٹھی پر مولانا محمود الحسن صاحب کا انتقال ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ مرنے سے کچھ گھنٹے پہلے ہی آزاد قبیلوں کے علاقے سے آئے ہوئے کچھ آدمیوں کو انہوں نے ہاتھیں دی بھٹیں اور چونکہ سننے اور بولنے کی طاقت اُس وقت بہت کم ہو گئی تھی ، اس لئے مولانا کے منہ پر کان رکھ کر سرحد کے اُن چٹانوں نے مولانا کی یہ آخری باتیں سنی تھیں۔

مولانا محمود الحسن صاحب نے اپنی امامت کے زمانے میں پچھلے دو سو برس سے چلی آ رہی دلی الہی تحریک میں دو خاص نئی باتیں کیں۔ پہلی یہ کہ انہوں نے غیر مسلمانوں کو شریک کر کے تحریک کو سچے معنوں میں تمام ہندستان کی تحریک بنا دیا اور دوسری یہ کہ اس میں عام ہندو کو شریک کر کے وہ اُسے ایک نیا راستہ دکھا گئے۔

مولانا عبید اللہ سندھی

دلی اللہی جماعت کے چھٹے امام مولانا محمود احسن صاحب کے اُن ساتھیوں اور شاگردوں میں، جنہوں نے ملک کی آزادی کی لڑائی میں نہایت دلیری کے ساتھ حصہ لیا، مولوی عبید اللہ سندھی کا نام ہمیشہ بڑی عزت کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔ مولانا عبید اللہ سندھی کو اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ جلاوطنی کی دل کنپا دینے والی مشکلوں میں بتانا پڑا۔

مولانا عبید اللہ سندھی کا جنم ۱۰ مارچ ۱۸۷۷ء کو میانوالی (پنجاب) کے ایک ہندو سے سکھ بنے ہوئے خاندان میں ہوا تھا۔ اُن کے باپ کا نام رام سنگھ تھا، جو سناگری اور ساہوکاری کا پیشہ کرتے تھے اور اپنے اس بیٹے کے جنم سے چار مہینے پہلے ہی چل بسے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عبید اللہ صاحب کو اپنے باپ کی محبت نہ مل سکی، لیکن اُن کے بابا حبیب رام اُن کے پیدا ہونے کے قریب دو سال بعد تک زندہ رہے۔ اس کے بعد عبید اللہ صاحب کی ماں اپنی مرضی کے ساتھ بائیس آگئیں۔ کچھ عرصے کے بعد وہ اپنے بھائی کے ساتھ بے پردہ ضلع ٹوبہ قازی خاں چلی گئیں اور وہاں رہنے لگیں۔ یہیں پر مولانا نے شروع کی تعلیم پائی اور بیسیں پر ۱۸۹۷ء میں اپنے ایک آریہ سماجی دوست کے ذریعے ملی

ہوئی ایک کتاب 'تحفۃ الہند' کے اثر میں آکر انھوں نے اسلام قبول کر لیا اور گھر چھوڑ کر سندھ جا پہنچے۔ اس وقت مولانا کی عمر صرف ۱۶ سال کی تھی۔

سندھ پہنچ کر مولانا نے کچھ دنوں تک اسلامی فلسفے کی شرح کی کتابیں پڑھیں جن کی طرف اُن کا خاص تہان تھا۔ اس کے بعد سکھر اسلامیہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر محمد عظیم خاں یوسف زئی کی لڑکی کے ساتھ اُن کی شادی ہو گئی۔ مولانا نے اس کے بعد سکھر میں ہی رہنے کا ارادہ کر لیا اور اس کی خبر اپنی ماں کو دے دی۔ ماں جو اپنے بیٹے کے دیوگ میں بے حال ہو رہی تھیں، یہ خبر ملتے ہی سکھر پہنچیں۔ پر اُن کو یہ دیکھ کر بڑا دھکا لگا کہ اُن کے بیٹے نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ پھر بھی بیٹے کی محبت کی وجہ سے وہ اُس سے دور رہنے کو تیار نہیں تھیں۔ اسی طرح مولانا کے دل میں بھی اپنی ماں کے لئے عزت اور محبت تھی، لیکن جس چیز کو وہ ٹھیک سمجھتے تھے اُسے کسی دُنیادی محبت کے لئے چھوڑ دینا بھی وہ گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ اتنا ہونے پر بھی انھوں نے کبھی اپنی ماں کو جو صرف اُن کے ہی آسرے پر تھیں، مسلمان بنانے کی کوشش نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی ماں اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے بھی برابر اُن کے ساتھ رہ سکیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا نے حالانکہ اپنے مذہب کو بدلا تھا، لیکن وہ ضروری مذہبی جوش اُن میں بالکل ہی نہیں تھا جو اکثر ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں جانے والوں میں پایا جاتا ہے۔

سندھ میں رہتے ہوئے مولانا کے ہاتھ کچھ کتابیں لکیں جو دلی الٰہی جماعت کے دوسرے امام شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے شاہ اسماعیل شہید کی لکھی ہوئی تھیں۔ ان کتابوں کے ذریعے مولانا کو سب سے پہلے دلی الٰہی جماعت کے اصولوں کی جانکاری ہوئی اور وہ اس کے بابت کچھ زیادہ معلوم کرنے کے لئے بے چین ہو اُٹھے۔ اسی سلسلے میں سندھ کے کچھ ایسے لوگوں سے بھی اُن کی جانکاری ہوئی جو دلی الٰہی جماعت سے تعلق رکھتے ہوئے ہندستان سے برٹش حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کی تیاری کر رہے تھے۔ مولانا نے بھی ان کے کام میں دلچسپی لینا شروع کر دیا اور جب اُن لوگوں کو یہ پکا یقین ہو گیا کہ مولانا ہر طرح سے اعتبار کے قابل ہیں اور اُن کے دل میں ملک کی آزادی کے لئے سچی تڑپ ہے تو اُن کو یہ بھید بھی بتا دیا کہ اس تمام سنگٹھن کے سب سے بڑے موجودہ نیتا دیوبند مدرسے کے ہیڈ ماسٹر مولانا محمود احسن صاحب ہیں۔ اتنا معلوم ہوتے ہی مولانا عبید اللہ سندھی دیوبند جا پہنچے۔ وہاں پہنچتے ہی انھوں نے مولانا محمود احسن صاحب سے پڑھنا شروع کر دیا اور کچھ دن بعد ہی انھوں نے مولانا محمود احسن صاحب کا اتنا یقین حاصل کیا کہ وہ اُن کی گپ چپ ہونے والی سیاسی مجلسوں میں بھی شریک ہونے لگے۔

اس وقت مولانا محمود احسن صاحب کے سامنے ایک خاص کام مدرسہ دیوبند کے دوپارہ تھیوں میں ویش بھکتی کا پرچار کرنا تھا جس سے آزادی کی لڑائی کے لئے اُن میں سے رگروٹ مل سکیں۔ اس کام کے لئے اُن کی صلاح سے مدرسہ دیوبند کے دوپارہ تھیوں

کا ایک سنگٹھن مولانا عبید اللہ نے بنایا، جس کا نام 'جمعیت الانصار' رکھا گیا۔ مولانا عبید اللہ خود اس کے جنرل سکریٹری بنے لیکن اس وقت تک مدرسہ دیوبند میں کچھ ایسے لوگ بھی کھس آئے تھے جن کو برٹش حکومت کی مخالفت کا نام سننے ہی کپکپی آنے لگتی تھی۔ ایسے لوگوں کو مولانا عبید اللہ سندھی کا دیوبند کے مدرسے میں رہنا کھٹکا اور انھوں نے اُن پر طرح طرح کے الزام لگانے شروع کر دیے بدستقی سے اُس وقت ان الزام لگانے والوں میں کچھ ایسے لوگ بھی شریک ہو گئے تھے، جن کو مولانا عبید اللہ بہت عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا عبید اللہ کا من دیوبند سے اوبنے لگا اور وہ سندھ واپس جانے کی سوچنے لگے۔ لیکن مولانا محمود احسن صاحب اپنے اس شاگرد کی غیر معمولی سچائی اور دماغی طاقت سے واقف ہو چکے تھے۔ اس لئے انھوں نے سمجھا بجا کہ مولانا عبید اللہ کو دہلی بھیج دیا، وہاں وہ 'مدۃ المعارف' کے نام سے ایک مدرسہ چلانے لگے۔ اس مدرسے کا ضروری کام کرنے کے لئے خود مولانا محمود احسن صاحب دہلی پہنچے اور حکیم اجل خاں صاحب و ڈاکٹر انصاری صاحب وغیرہ اپنے خاص خاص دوستوں سے مولانا عبید اللہ کی جان پہچان کرا کر اُن سے یہ وعدے کئے کہ وہ وقت ضرورت مدرسے کی مدد کرتے رہیں گے۔

جیسا کہ روٹ کمیٹی کی رپورٹ میں بھی ذکر ہے، دہلی آ جانے کے بعد بھی مولانا عبید اللہ مولانا محمود احسن صاحب سے ملنے کے لئے برابر دیوبند آتے جاتے رہے۔ اسی پنج میں مولانا

عبید اللہ نے دہلی میں ایک انقلابی پارٹی کھڑی کر لی تھی جس کا مقصد ہتھیاروں کے ذریعے انگریزوں کو ہندستان سے باہر نکال دینا تھا۔ یہ ۱۹۱۳ء کا زمانہ تھا اور ہندستان کے دوسرے حصوں میں بھی خاص کر بنگال اور پنجاب میں اسی طرح کے اور بھی بہت سے سنگٹھن قائم ہو چکے تھے۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے ان سنگٹھنوں سے بھی اپنا تعلق قائم کرنے کی کوشش کی جس کا ذکر ہندستان کے ایک بہت بڑے کرائی کاری شری شیچندر ناتھ سانیال نے اپنی کتاب 'بندی جیون' میں کیا ہے۔

اس کے کچھ دن بعد ہی یورپ میں لڑائی کے ہکا بڑے گنگنا اُٹھے۔ مولانا محمود الحسن صاحب نے اس موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہا اور مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل جانے کے لئے کہا۔ مولانا محمود الحسن صاحب کی عادت تھی کہ وہ نزدیک سے نزدیک کے آدمی کو بھی صرف اتنی ہی باتیں بتاتے تھے جتنی بتانا ضروری ہوتا تھا۔ اس وجہ سے مولانا عبید اللہ سندھی جلتے تھے کہ کابل میں مولانا محمود الحسن صاحب کا کتنا اثر ہے۔ ادھر وہ دہلی میں کافی کام کر چکے تھے۔ اس لئے اُن کی رائے کابل جانے کی نہیں تھی۔ اسی وجہ سے جب ایک دن مولانا محمود الحسن صاحب نے اکسمات ہی مولانا عبید اللہ سے کہا "عبید اللہ! کابل جاؤ" تو عبید اللہ صاحب نے کچھ حیرانی کے ساتھ پوچھا "کیوں؟" مولانا محمود الحسن صاحب نے اس کا کچھ جواب نہ دیا اور خاموش ہو گئے۔ دوسرے دن بھی انہوں نے مولانا عبید اللہ سے اسی طرح کہا اور مولانا کے کابل جانے کی وجہ پوچھنے پر خاموش ہو گئے۔ لیکن اُن کی آنکھوں میں

تھوڑی سی ناراضی کی جھلک عبید اللہ صاحب کو محسوس ہوئی۔ اس سے مولانا عبید اللہ کو بڑا دھکا لگا اور وہ یہ انتظار کرنے لگے کہ اُن کو پھر کابل جانے کا حکم ملے اور وہ اُس کی تعمیل کر سکیں۔

دو چار دن بعد ہی مولانا محمود الحسن صاحب نے مولانا عبید اللہ سے پھر کہا۔ ”عبید اللہ کابل جاؤ“ عبید اللہ صاحب نے یہ سنتے ہی ”ہاں“ کر دی اور کابل جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اُس وقت اُن کے پاس اتنا پیسہ نہ تھا کہ اس سفر کا انتظام کر سکیں، لیکن اس کا ذکر مولانا محمود الحسن صاحب سے کرنا ان کو اچھا نہ لگا۔ آخر ان کے ایک شاگرد شیخ عبدالرحیم (آچاریہ کرلانی جی کے بڑے بھائی) نے اپنی بیوی کے زیور بیچ کر اس سفر کا خرچہ بنایا اور مولانا عبید اللہ اپنے تین ساتھیوں کو لے کر اگست ۱۹۱۵ء میں ہندستان کی سرحد پار کر کے کابل کی طرف چل پڑے۔ راستے میں بہت سی دقتوں کا سامنا کرتے ہوئے ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو مولانا کابل میں داخل ہو گئے۔ اس وقت اُن کے پاس خرچ کے لئے صرف ایک پونڈ بچا تھا اور اُن کو اتنا بھی معلوم نہیں تھا کہ آخر اس بیگانے ملک میں اُن کو کیوں بھیجا گیا ہے۔ اپنی اس حالت کا ذکر کرتے ہوئے اپنی ڈائری میں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے: ”۱۹۱۵ء میں شیخ احمد کے حکم سے کابل گیا۔ مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا تھا، اس لئے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی۔ لیکن تعمیل حکم کے لئے جانا ضروری تھا۔ خدا نے اپنے فضل سے بھلنے

کا راستہ صاف کر دیا اور میں افغانستان پہنچ گیا۔ دلی کی سیاسی جماعت کو جب میں نے یہ بتایا کہ میرا کابل جانا طے ہو چکا ہے تو اُس نے بھی اپنا ناماندہ مجھے بنادیا لیکن کوئی معقول پروگرام وہ بھی مجھے نہیں بتا سکے، ان لفظوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا عبید اللہ صاحب ڈسپلن کی پابندی کا کتنا خیال رکھتے تھے۔

کابل پہنچ کر بھی مولانا عبید اللہ صاحب کو بڑی بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ شروع شروع میں تو اُن کو کابل سرکار نے نظربند کر کے جیل میں بند کر دیا، جہاں کچھ اور بھی ہندوستانی، جو اسی مقصد سے کابل آئے تھے، بند تھے۔ اس کے بعد جرمن ٹرکشن مشن

کے ساتھ راجا ہندو پرتاپ کابل پہنچے۔ تب اُن تمام ہندوستانیوں کے ساتھ مولانا عبید اللہ سندھی کو بھی رہائی ملی رہا ہوئے کے بعد مولانا عبید اللہ جنرل نادر خاں سے ملے جن کو مولانا عبید اللہ کے مشن کی خبر پہلے ہی لگ چکی تھی۔ جنرل نادر خاں نے مولانا کو ہر طرح کی مدد دینے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد ہی کابل میں ایک عارضی آزاد ہند سرکار بنائی گئی اور مولانا عبید اللہ کو اس میں ہوم ممبر کا عہدہ دیا گیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی آزادی کے لئے لڑنے والوں کی جو فوج کابل میں کھڑی کی جانے والی تھی، اُس کے جنرل بھی مولانا عبید اللہ صاحب کو ہی بنایا گیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں بھی 'خدائی فوج' کے نام سے ایک فوج کا سنگٹھن کرنا طے ہوا، جس کے سب سے بڑے کمانڈر مولانا محمود الحسن صاحب چُنے گئے

مولانا عبید اللہ سندھی نے ان تمام فیصلوں کی خبر مولانا محمود الحسن صاحب تک پہنچانا ضروری سمجھا۔ مولانا محمود الحسن صاحب اس وقت مکے میں تھے۔ مولانا عبید اللہ صاحب نے پیلے ریشم پر اُن کے لئے ایک خط لکھوایا، جو اس کاریگری سے لکھا گیا تھا کہ دیکھنے میں تو وہ پتھوں سے معلوم ہوتے تھے، لیکن دراصل اُس میں لڑائی کا تمام نقشہ اور ان تمام کاموں کی رپورٹ تھی۔ یہ ریشم پر کڑھا ہوا خط عبدالحق نام کے ایک وڈیار تھی کو سونا گیا، کہ وہ اُسے شیخ عبدالرحیم تک پہنچا دے۔ اس کے بعد شیخ عبدالرحیم اُسے مولانا محمود الحسن صاحب کے پاس تک پہنچوا دیتے۔ لیکن عبدالحق نے ہندستان میں آتے ہی یہ خط خان بہادر حق نواز خاں کو دے دیا اور خاں صاحب نے اُسے سرانگیل اوڈیار تک پہنچا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کو یہ تمام مجسید معلوم ہو گیا۔ مولانا محمود الحسن صاحب مکے میں فوراً گرفتار کر لئے گئے۔ شیخ عبدالرحیم کے نام بھی وارنٹ نکلا، لیکن وہ فرار ہو گئے۔ انگریزوں نے کابل کے امیر حبیب اللہ خاں پر یہ زور ڈالا کہ وہ مولانا عبید اللہ سندھی اور اُن کے ساتھیوں کو انگریزوں کے حوالے کر دیں۔ امیر حبیب اللہ اس وقت انگریزوں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ ان تمام لوگوں کو انگریزوں کے ہاتھوں میں دینے کو بھی تیار تھے۔ لیکن امیر کے چھوٹے بھائی نصرت اللہ خاں اور امیر کے بڑے کے امان اللہ خاں وغیرہ انگریزوں کے خلاف تھے۔ ان لوگوں نے امیر کو ایسا تو

نہ کرنے دیا۔ پھر بھی مولانا کو گرفتار کر کے کابل کی جیل میں تو ڈال ہی دیا گیا۔ مولانا نے جیل سے بھی اپنے کام کو جاری رکھا اور وہ افغانستان کی اُس پارٹی کی برابر مدد کرتے رہے، جو انگریزوں کے خلاف تھی۔ کچھ دن بعد ۱۹ فروری ۱۹۱۹ء کو امیر حبیب اللہ خاں انگریزوں سے ملے رہنے کی اپنی پالیسی کے کارن قتل کر دئے گئے اور امان اللہ خاں کابل کی گدی پر بیٹھے۔ امان اللہ خاں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ عبید اللہ صاحب اور اُن کے ساتھیوں کو جیل سے چھوڑ دیا اور مولانا سے اپنے راج کا جی معاملوں میں بھی صلاح لینے لگے۔

اس وقت تک یورپ کی بڑی لڑائی ختم ہو چکی تھی، جس میں حالانکہ انگریز جیت گئے تھے۔ لیکن اُن کی اُمتام طاقت خراج ہو چکی تھی۔ ادھر ہندوستان میں رولٹ بل کے خلاف ستیہ گرہ چالو تھا اور پنجاب میں تو صرف مارشل لا کے بل پر حکومت چلائی جا رہی تھی۔ عبید اللہ صاحب نے محسوس کیا کہ اگر اس وقت کابل ہندوستان پر چڑھائی کر دے، تو کابل اور ہندوستان دونوں ہی انگریزوں کے پنجوں سے جھوٹ سکتے ہیں۔ اُنھوں نے بادشاہ امان اللہ خاں صاحب کے سامنے اپنا یہ خیال رکھا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ۹ مئی ۱۹۱۹ء کو یکایک افغانستان نے انگریزوں کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے ہوتے ہی سرحد کے آزاد قبیلے بھی مولانا عبید اللہ صاحب کے ایک دوسرے ساتھی ننگ زئی کے ساتھی صاحب کی رہنمائی میں انگریزوں کے خلاف کھڑے ہو گئے۔

طرائق ۴ جولائی تک چلی۔ اس کے بعد انگریزوں کو افغانستان سے صلح کرنی پڑی، جس کے مطابق افغانستان کی مکمل آزادی منظور کی گئی اور اُسے دوسرے دوسرے ملکوں سے بنا انگریزوں کی اجازت لئے اپنے سمبندھ قائم کرنے کا اختیار دیا گیا۔ اس کے بدلے میں انگریز سرکار کی طرف سے یہ شرط رکھی گئی کہ کابل کی سرکار مولانا عبید اللہ کو کوئی سیاسی کام کابل میں نہیں کرنے دے گی۔ اس شرط کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا عبید اللہ نے کابل ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ کابل کی سرکار مولانا کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے تیار تھی، لیکن مولانا عبید اللہ صاحب کے دل میں تو ہندستان کی آزادی کی چاہ تھی۔ اس لئے وہ اس شرط کو منظور ہی کیسے کر سکتے تھے۔ وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ کابل چھوڑتے ہی اُن کو سخت تکلیفیں خاص کہ روپے پیسے کی بھاری تنگی اُٹھانی پڑے گی۔ لیکن اُنھوں نے کچھ دن بعد ہی کابل چھوڑ دیا۔ اسی نتیجہ اُنھوں نے ایک خاص کام یہ بھی کیا تھا کہ کابل میں کانگریس کی ایک شاخ قائم کر دی جس کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اپنے گیارہ سشن میں منظور بھی کر لیا۔ کانگریس کی یہ پہلی شاخ تھی جو ہندستان سے باہر کسی دوسرے ملک میں قائم ہوئی تھی۔

کابل چھوڑنے کے بعد مولانا عبید اللہ دیوبند پہنچے اور قریب سات مہینے تک ماسکو میں رہ کر کمیونزم کے اصولوں کو پڑھتے اور سمجھتے رہے۔ لیکن وہ کمیونسٹ پارٹی میں شریک نہ ہونے کے کیونکہ

غدا پرستی اور دوسری مذہبی باتوں کے لئے اس کیونزم میں کوئی گنجائش
 اُن کو نہ دکھلائی دی۔ اس کے بعد وہ ترکی پہنچے اور وہاں
 قریب تین سال تک رہے۔ یہاں اُنھوں نے ”بین اسلامک“ کی
 تحریک پر کافی غور کیا۔ لیکن اُس میں کامیابی کی کوئی اُمید دکھائی
 نہیں دی۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ انڈین نیشنل کانگریس میں
 ہی اسلام کی مذہبی تحریک کو بھی شریک کر دیا جائے۔ اس پر اُنھوں
 نے ایک کتاب لکھی جو ترکی میں ہی چھپی۔ اسی زمانے میں لالہ لاجپت
 رائے اور ڈاکٹر انصاری صاحب بھی گھومتے گھاتے ترکی پہنچے۔
 مولانا عبید اللہ ہندستان کے ان دونوں نیتاؤں سے ملے۔ اس کے
 کچھ دن بعد ہی اُٹلی جا کر وہ پنڈت جواہر لال سے بھی ملے اور
 اُن سے بھی اپنے اس پروگرام پر بات چیت کی۔ اس پروگرام کی
 خاص بات یہ تھی کہ اُس میں اہلسنا پر بہت زور دیا گیا تھا۔ جواہر
 لال جی نے اپنی مشہور کتاب ’میری کہانی‘ میں مولانا کے اس
 پروگرام کو ”ہندو مسلمانوں کے سوال کو حل کرنے کی ایک کافی
 اچھی کوشش“ بتایا ہے۔

اس کے بعد مولانا کچھ دنوں تک اسی طرح ایک ملک سے
 دوسرے ملک میں گھومتے رہے۔ نہ پاس میں پیسہ، نہ کوئی ساتھی
 اور نہ کوئی ہمدرد۔ برٹش حکومت کے غصیہ ہر وقت مولانا کے ساتھ
 لگے رہتے تھے اور پریشان کرتے رہتے تھے۔ پر ان تکلیفوں کے باوجود
 مولانا اپنی دھن میں لگے رہتے تھے۔

کچھ دن بعد مولانا کو معلوم ہوا کہ مکہ میں ایک خلافت

کانفرنس ہونے والی ہر جس میں ہندستان کے نمائندے بھی حصہ لیں گے۔ مولانا نے اس موقع پر مکہ پہنچنا ضروری سمجھا اور وہ اٹلی کے راستے مکہ کے لئے چل پڑے، وہ جب مکہ پہنچے تب تک کانفرنس ختم ہو چکی تھی اور ہندستان کے نمائندے بھی وہاں سے چل دئے گئے۔ اس کے بعد مولانا نے مکہ میں ہی رہنا طے کیا اور وہیں پڑھنا پڑھانا شروع کر دیا۔

۱۹۳۶ء میں کانگریس نے مولانا کو ہندستان آنے کی اجازت دینے کے لئے آواز اٹھائی۔ کچھ دن بعد سندھ میں خانہوار اللہ بخش کی سرکار بنی اور کانگریس کو اپنی اس تحریک میں کامیابی ہوئی۔ ۱۰ نومبر ۱۹۳۷ء کو برٹش حکومت سے مولانا کو یہ اطلاع ملی کہ وہ ہندستان آ سکتے ہیں۔ ارجنوری مسئلہ کو مولانا نے پاسپورٹ بھی حاصل کر لیا اور وہ حج کر کے قریب ۲۲ سال بن اپنی پیاری جنم بھومی کی گود میں واپس آ گئے۔ یہاں آ کر پہلے وہ اپنے تمام پرلنے ساتھیوں سے ملے اور اُس کے بعد دلی میں رہ کر شاہ ولی اللہ کے اصولوں کا پرچار کرتا اُنھوں نے شروع کر دیا جو وہ اپنی آخری سانس تک کرتے رہے۔ جلاوطنی کی تکلیفیں اور پریشانیاں اُن کے دیش بھکتی کے جذبے کو کم نہیں کر سکی تھیں۔

مولانا کا انتقال ۲۱ اگست ۱۹۴۴ء کو دین پور (بھاول پور) میں ہوا۔ اپنے آخری وقت تک وہ ہندو مسلم ایکتا کے زبردست حامی رہے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ سب سے بڑی خدا پرستی یہی ہے کہ ہم سبھی انسانوں سے، پھر چاہے وہ کسی بھی قوم یا مذہب کے

ہوں اپنے دل سے محبت کریں۔ اپنے ایک مضمون میں انھوں نے اپنے اس خیال کو ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا۔
 ”ایمان باللہ یا خدا پرستی کی ایک منزل انسانیت دوستی بھی ہے۔ اگر آدمی یہ مانتا ہے کہ سارے انسان اُسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں، اور اُس کو خالق سے حقیقی محبت ہے، تو لازمی ہے کہ اُسے اُس کی مخلوق سے بھی محبت ہو اور اگر اُسے اُس کی مخلوق سے محبت نہیں، تو یہ سمجھے کہ وہ خدا کے محبت کے دعوے میں سچا نہیں۔ ہمارے صوفیائے کرام نے تو خدا پرستی کی عملی شکل میں انسانیت دوستی کو ہی اصل دین قرار دیا تھا۔ اُن کا تو یہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ جسے صرف اپنے گروہ اور جماعت سے محبت ہے اور وہ دوسروں کو، جو ہم عقیدہ نہیں ہیں، نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، وہ سچا موحداور خدا پرست ہی نہیں ہے۔“

کاش! آج کا ہندستان اپنے اس دیش بھکت شہید کے ان سونے کے حرفوں میں لکھے جانے لائق لفظوں کا اصلی مر مسمجھ سکے اور اُن پر عمل کر سکے۔

حاجی فضل حسن

ہندستان کی کچھی اُتری سرحد پر بسا ہوا قبائلی علاقہ اور اُس میں رہنے والی پٹھان قوم ہمیشہ اس بات کے لئے مشہور رہی ہے کہ اُس نے کبھی پوری طرح سے نہ تو انگریزوں کی غلامی ہی منظور کی اور نہ اُس نے کبھی برٹش حکومت کو چین سے ہی بیٹھنے دیا۔ انگریزوں نے شروع سے ہی وہاں پر اپنی پوری فوجی طاقت لگائی اور اپنی عادت کے مطابق پٹھانوں میں پھوٹ ڈالنے اور اُن کو بھٹسلانے، للچانے کی بھی ایسی برقی، لیکن پٹھان کسی نہ کسی سردار کی ماتحتی میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کرتے ہی رہے۔ انگریزوں کے پرچار نے پٹھانوں کی اس آزادی کی بڑائی کو ٹوٹ مار کے نام سے بدنام کیا۔ اور اُن کے بہادر نیتاؤں کو بھی لیٹا اور ڈاکو کی شکل میں جنتا کے سامنے پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ حاجی فضل واحد صاحب بھی، جن کو عام جنتا ترنگ زنی کے صاحبی کے نام سے ہی جانتی اور پہچانتی ہے، ہمارے نزدیک سرحد کے اور دوسرے لیٹرے قبائلی سرداروں کی طرح فقط ایک ہمت ور لیٹرے سردار ہی بن کر رہ گئے، اور اُن کی شخصیت کی بندی اور ہندستان کی آزادی کی بڑائی میں اُن کی اہمیت کو صرف لانے گئے لوگ ہی جان سکے۔

حاجی فضل واحد صاحب دراصل ولی اللہی آندولن

کے ہی ایک نیتا تھے، جن کی پیری مُریدی کا سلسلہ دلی اللہی جماعت کی اُس شاخ سے ملتا تھا جو ۱۲۴۸ھ میں سید احمد صاحب بریلوی کی لیڈری میں انگریزوں کے دوست سکھوں سے لڑنے کے لئے سرحد پر چلی آئی تھی۔ سید احمد صاحب کے مرنے کے بعد اُن کے شاگردوں نے اُن کے کام کو جاری رکھا اور جب ۱۲۴۹ھ میں سرحد کا یہ علاقہ انگریزوں کی حکومت میں آگیا، تو ستیانام کے پہاڑی مقام پر اُنھوں نے اپنی چھاؤنی بنا کر انگریزوں سے لڑنا شروع کر دیا۔ ۱۲۵۰ھ میں انگریزوں نے جب اس چھاؤنی کو برباد کر دیا تو ہمیں کے لوگ پیشاور سے اُتر پورب کی طرف بے ہوئے ملک گاؤں میں جا کر رہنے لگے۔ اس پر ۱۲۵۱ھ کے اکتوبر مہینے میں انگریزوں نے قریب ۵۰۰۰ فوج لے کر ملک پر بھی چڑھائی کر دی اور دو مہینے کی گھنٹھور لڑائی کے بعد ملک کو تحس تحس کر دیا۔ اس کے بعد ان لوگوں کو، جو اپنے کو 'مجاہدین' کہتے تھے، پکھر جانا پڑا اور اُنھوں نے الگ الگ قبیلوں میں جا کر انگریزوں سے لڑنے کے لئے الگ الگ سنگٹھن بنانے شروع کر دیے۔ ان لوگوں میں سے ہی ایک تھے۔ مولانا نجم الدین صاحب، جن کا سرحد کی تاریخ میں 'ملا ہڈا' کے نام سے ذکر ملتا ہے اور جنھوں نے اپنی زندگی بھر کبھی انگریزوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔

حاجی فضل داحد صاحب ان ملا ہڈا کے ہی شاگرد اور خلیفہ تھے اس لئے جب ملا ہڈا کا انتقال ہوا، تو اُن کے تمام شاگردوں اور مُریدوں نے حاجی فضل داحد صاحب کو ہی

اپنا نیتا چٹا . اُس وقت حاجی فضل واحد صاحب اپنے تمام خاندان کے ساتھ اپنے گاؤں ترنگ زئی میں رہتے تھے . ترنگ زئی پیشادہ ضلع کی چرسدا تحصیل میں ہے اور سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں صاحب کے گاؤں اُتمان زئی سے صرف ایک میل کی دوری پر ہے . ترنگ زئی گاؤں کے باشندے ہونے کی وجہ سے ہی حاجی فضل واحد صاحب ، حاجی ترنگ زئی کے نام سے مشہور ہوئے .

اپنے گرد کی سند پر بیٹھ جانے کے بعد مجاہدین کے رواج کے مطابق حاجی فضل واحد صاحب کے لئے یہ لازمی تھا کہ دسے انگریزوں کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیں . اُن کے دوسرے ساتھیوں نے اس کے لئے حاجی صاحب پر بڑا زور ڈالا . لیکن حاجی صاحب نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا . کیونکہ اس طرح پناہ موقع دیکھے ہوئے لڑتے رہنا دسے صرف اپنی بربادی کو دعوت دینا سمجھتے تھے . اُن کا کہنا تھا کہ اس طرح کی لڑائی میں ابھی تک پٹھان قوم اپنے ہزاروں سپوتوں کو کھو چکی ہے . لیکن انگریزوں کی طاقت اور حکومت کا پھیلاؤ سرحد میں بڑھتا ہی گیا ہے . اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم صرف لڑنے کے لئے ہی لڑتے رہیں ہیں جو عقش مندی اور دور اندیشی کی بات نہیں ہے . اس لئے اب ہم کو پہلے اپنی طاقت بڑھانی چاہئے اور قبائلی علاقے سے باہر ہنسنے والے پٹھانوں اور غیر پٹھانوں میں بھی آزادی کی چاہ پیدا کرنی چاہئے ، جس سے انگریزوں سے لڑائی چھڑنے پر ہمارے یہ بھائی ہمارے مقابلے میں نہ آویں اور ہم انگریزی حکومت پر کوئی کمراری چوٹ کر سکیں .

سرحد کی تواریح میں اس طرح حاجی فضل واحد صاحب پہلے نیا تھے جنہوں نے پٹھاؤں کی آزادی کے مسئلے کو پورے ہندوستان کی آزادی کے مسئلے کے ساتھ ملا کر سوچا، اور 'جہاد' کے مذہبی جوش سے الگ رہ کر اُس پر ایک سیاسی لیڈر کی طرح غور کیا۔ یہ ٹھیک ہو کہ اگر اسی طرح کی باتیں کوئی دوسرا لیڈر کرتا، تو اُس کے ساتھی پٹھان ہی، اپنے اُس لیڈر کو انگریزوں کا بھیدیا سمجھتے اور اُس کی بوٹی بوٹی اڑا دیتے۔ لیکن حاجی فضل واحد صاحب کی سچائی، نیک چلنی اور خدا پرستی کا اُن کے ساتھیوں پر اتنا گہرا اثر تھا کہ کسی نے بھی حاجی صاحب کے اس خیال کے خلاف چوں تک نہیں کی اور اُن کے کہنے کے مطابق چلنا منظور کر لیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شروع سے ہی حاجی صاحب نے اپنے ساتھیوں کا کتنا یقین حاصل کر لیا تھا۔

اس کے بعد حاجی صاحب نے پورے ہندوستان کی سیاست پر غور کیا اور اُنہوں نے یہ کھوج کرنی شروع کی کہ ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں میں کون سی پارٹی اُن کی مدد کر سکتی ہے۔ اُس وقت دلی، الہی جماعت کے چھٹے امام مولانا محمود الحسن صاحب بھی سرحدی صوبے سے اپنا تعلق قائم کرنے کی فکر میں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۰۹ء کے قریب حاجی فضل واحد صاحب اور مولانا محمود الحسن صاحب میں خطوں کے ذریعے کچھ جان پہچان ہوئی۔ پہلے حاجی صاحب نے قبائلی علاقے کے کچھ لوگوں کو پڑھنے کے بہانے دیوبند بھیجا، اور جب ان لوگوں سے یہ معلوم کر لیا کہ مولانا محمود الحسن صاحب ہندوستان کی

آزادی سچ سچ ہی چاہتے ہیں اور اُس کے لئے سب عرص کی قربانی کرنے کو تیار ہیں، تو اُنہوں نے بھی مولانا محمود الحسن صاحب کو اپنا نیتا مان لیا۔ اس طرح دلی اللہی جماعت کی ان دونوں شاخوں کا رشتہ جو ۱۹۲۵-۲۶ء میں ٹوٹ گیا تھا، پھر سے قائم ہو گیا۔

اس کے قریب دو سال بعد حاجی فضل واحد صاحب نے اپنے علاقے میں مدرسے قائم کرنے شروع کئے۔ ان مدرسوں میں یوں دیکھنے کے لئے تو دیوبند کے مدرسے کی طرح مذہبی تعلیم ہوتی تھی، لیکن حاجی صاحب کا ارادہ تھا کہ ان مدرسوں کے ذریعے ہی پٹھانوں میں آزادی کا سدیش پھیلایا جائے۔ تعلیم کے لئے اُس وقت تک سرحد میں اس طرح کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس لئے پٹھانوں نے حاجی صاحب کے اس کام کو بہت پسند کیا اور خان عبدالغفار خاں صاحب تو پہلے پہل ان مدرسوں کی وجہ سے ہی قومی کام کے میدان میں آئے۔ اسی لئے خان عبدالغفار خاں صاحب آج بھی حاجی فضل واحد صاحب کو اپنا اور تمام سرحد کا سب سے پہلا سیاسی پیشوا مانتے ہیں۔

حاجی صاحب کے یہ مدرسے کچھ دن تک تو چلے، لیکن اُس کے بعد ہی علی گڑھ یونیورسٹی کے ایک دیوار تھی انیس احمد کے ذویئے انگریزوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ حاجی صاحب کا کچھ تعلق دیوبند کے مدرسے سے بھی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرحد کے انگریز حاکموں نے اسکوئوں کو زبردستی بند کر دیا اور حاجی صاحب پر کڑی نظر رکھنی شروع کر دی۔ اُس وقت کچھ انگریز حاکموں کی رائے تو حاجی صاحب

کو گرفتار کر لینے کی بھی تھی۔ لیکن سرحد پر حاجی صاحب کا جیسا اثر تھا، اُس کو دیکھتے ہوئے انگریزوں کو ایسا کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ صرف اُنھوں نے بہت سے جاسوس حاجی صاحب کے پیچھے لگا دیے۔

حاجی صاحب اس حالت میں بھی گھبرائے نہیں اور اُنھوں نے چُپ چاپ اپنے کام کو جاری رکھا۔ اتنی نگرانی ہونے کے باوجود بھی مدرسہ دیوبند اور مولانا محمود الحسن صاحب سے اُن کا تعلق برابر بنا رہا اور دس پٹھانوں میں آزادی کا پرچار کرتے رہے۔

کچھ دن بعد ہی سکافلہ میں یورپ میں لڑائی شروع ہوئی تو مولانا محمود الحسن صاحب نے حاجی صاحب کو یہ سندیش بھیجا کہ ہم لوگوں کو اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر انگریزوں کے خلاف فوراً لڑائی شروع کر دینی چاہئے۔ یہ سندیش پاتے ہی، ۲۰ جون ۱۹۱۴ء کو حاجی صاحب اپنے تمام خاندان کے ساتھ چُپ چاپ برٹش علاقے سے نکل کر قبائلی علاقے میں چلے گئے اور اُنھوں نے انگریزوں کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کا ہونا تھا کہ قبائلی پٹھانوں کی فوجیں جگہ جگہ اکٹھی ہونی شروع ہو گئیں، جس کے سُپریم کمانڈر حاجی صاحب چُنے گئے۔ ان فوجوں نے سب سے پہلا حملہ ۱۷ اگست کو امیلا درے میں ہو کر برٹش علاقے پر کیا اور اُس پر قبضہ بھی کر لیا، جو کئی دنوں تک بنا رہا۔ اس کے بعد ادپری استخان کی طرف سے ایک حملہ کیا گیا اور وہاں کی چوکیوں سے انگریزی فوجوں کو بھگا دیا گیا۔ اسی طرح کئی اور حملے بھی جگہ جگہ کئے گئے جن میں انگریزوں کی کئی پلٹنیں

صفا کردی گئیں۔

ان لڑائیوں سے حاجی صاحب اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک ہمارے پاس رسد اور ہتھیاروں کا اچھا انتظام نہیں ہوگا، تب تک کامیابی ملنا مشکل ہے۔ ان چیزوں کا انتظام کرنے کے لئے حاجی صاحب نے مولانا محمود الحسن صاحب کو لکھا۔ اس پر مولانا نے اپنے شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل بھیجا اور خود گنہ مدنیہ پہنچ کر غالب پاشا وغیرہ سے ملے۔ لیکن کچھ ایسی مشکلیں سامنے آئیں کہ نہ تو حاجی صاحب کو کابل سے ہی مدد مل سکی اور نہ ٹرکی سرکار سے ہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حاجی صاحب کی تمام فوجیں دھیرے دھیرے بکھر گئیں اور ملک کی آزادی کا اُن کا سنا پورا نہ ہو سکا۔ اسی پنج مولانا سیف الرحمان وغیرہ حاجی صاحب کے کچھ ساتھی بھی انگریزوں سے جا ملے اور انہوں نے حاجی صاحب کو پکڑوانے کے بھی جال رپے، لیکن حاجی صاحب کی ہوشیاری کی وجہ سے وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔

یورپ کی لڑائی ختم ہوتے ہی ایک طرف تو ہندستان میں رولٹ بل کے خلاف تحریک شروع ہوئی اور دوسری طرف کابل کے نئے بادشاہ امان اللہ خاں صاحب نے ہندستان پر چڑھائی کر دی۔ کابل سے ہونے والی اس چڑھائی میں حاجی صاحب کا پورا ہاتھ پہلے سے ہی تھا، کیونکہ بادشاہ امان اللہ سے یہ ملے ہو چکا تھا کہ ہندستان سے انگریز سلطنت ختم کرنے میں ہندوستانی

کابل کی مدد کریں گے ، جس کے بدلے میں کابل ہندستان کی آزادی منظور کرے گا ۔ اسی وجہ سے حاجی فضل واحد صاحب نے اس لڑائی میں بھی پورا حصہ لیا اور انگریزوں کو گہرا نقصان پہنچایا ۔ لیکن کچھ ہی دن بعد کابل سرکار اور برٹش سرکار میں صلح ہو گئی جس کے مطابق کابل کی مکمل آزادی انگریزوں نے منظور کر لی ۔ اپنی آزادی منظور کر کے کابل کی فوجیں واپس لوٹ گئیں اور حاجی صاحب کو پھر ایک بار ناکامیابی کا کڑوا پھل چکھنا پڑا ۔ لیکن پھر بھی دے ہمت کے ساتھ اپنے اصولوں پر جے رہنے والے انھوں نے دوسرے قبائلی سرداروں کی طرح برٹش حکومت سے کبھی معافی کی درخواست نہیں کی ۔

اس کے بعد ۱۹۲۰ء میں تمام ہندستان کی طرح سرحد میں بھی اسیوگ کی آمدنی اُٹھی ، جس کی رہبری حاجی صاحب کے پڑنے ساتھی خان عبدالغفار خاں صاحب کر رہے تھے ۔ اُسی پنج مولانا محمود الحسن صاحب بھی مالٹا کی نظر بندی سے رہا ہو کر ہندستان واپس آ گئے تھے اور انھوں نے اس تحریک میں دلچسپی لینا شروع کر دیا تھا ۔ حاجی صاحب نے بھی اس آندولن میں دلچسپی لینا شروع کیا ۔ لیکن برٹش علاقے سے باہر رہنے کے کارن دے اس میں کوئی خاص حصہ نہیں لے سکے ۔ ہاں ، انھوں نے اتنا ضرور کیا کہ جب تک اسیوگ چلتا رہا ، انھوں نے اپنے اثر کے قبیلوں کو شات بنائے رکھا ، جس سے انگریز حکومت قبائلیوں کی بغاوت کا بہانہ نہ کر سکتی تھی ۔ پٹانوں پر زیادہ ظلم نہیں کر سکی ، جو اس تحریک میں حصہ لے رہے تھے

اسیوگ کے ہی زمانے میں ہجرت کی بھی آندھی اُٹھی، جس میں ہزاروں مسلمان ہندستان سے نکل کر کابل اور دوسرے دوسرے اسلامی ملکوں میں بسنے کے لئے چلے گئے۔ حاجی صاحب نے اس وقت ہجرت کرنے والے لوگوں کی پوری پوری مدد کی اور جو لوگ اُن کے علاقے سے ہو کر نکلے اُن کی پوری طرح سے حفاظت کی اسی ہجرت کے سلسلے میں جب خان عبدالغفار خاں صاحب کابل گئے تھے تب آتے جاتے ہوئے حاجی صاحب سے اُن کی بھی ملاقات ہوئی تھی۔

اس کے بعد حاجی صاحب نے پشتو میں ایک اخبار نکالنا شروع کیا جس کے پشتو نام کا ترجمہ 'چنگاری' ہوتا ہے۔ یہ اخبار شاید پشتو میں نکلنے والا پہلا اخبار تھا جو پہاڑیوں کی بھپی ہوئی گچھاؤں میں چھاپا جاتا تھا۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۸ء تک جب تمام ہندستان کی طرح سرحد میں بھی ہندو مسلمانوں کے بیچ تناؤ پھیلا ہوا تھا، تب اس اخبار کے ذریعے حاجی صاحب نے لوگوں کو صحیح راستہ دکھانے میں بہت بڑا کام کیا تھا اس طرح حاجی صاحب ایک پُر اثر مولوی، ایک ادیب درجے کے کمانڈر اور ایک دور اندیش لیڈر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے اخبار نویس بھی تھے۔

اس کے بعد ۱۹۳۰ء میں جب پھر کانگریس نے آزادی کی لڑائی کا اعلان کیا تو حاجی صاحب کی پوری ہمدردی اُن کے ساتھ تھی۔ اور جب سرکاری (منسور) نے خدائی خدمت گاروں پر دل ہلانے والے ظلم کرنے شروع کئے، تو بوڑھے حاجی صاحب

نے جون ۱۹۳۰ میں، مہندوں اور آفریدیوں کے ایک لشکر کے ساتھ پیشاور پر حملہ بول دیا، جس نے کچھ سے کچھ لے لئے تو انگریزوں کو بڑی بھیانک مشکل میں ڈال دیا تھا۔

سن ۱۹۳۱ء کے بعد کے کسی سال میں حاجی فضل واحد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اُس دن سرحد کے انگریز حاکموں نے گھی کے چسہ رخ جلائے اور ابھائے ہندستانی یہ جان بھی نہ سکے کہ آج اُن کے پیش کا ایک ایسا دیش بھکت سپوت ہمیشہ کے لئے اُن کو چھوڑ کر چلا آیا ہے۔ جو اپنی زندگی بھر ہندستان کی آزادی کے لئے لڑتا رہا اور جس کے نام سے ہندستان کے دشمن تحقیر کا نپتے تھے۔

ولی اسی تحریک کی تاریخ میں حاجی فضل واحد صاحب کی ایک الگ کہانی ہے، جو بہت کم لوگوں کی نظروں میں آئی ہے، لیکن اُس اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور سرحدی صوبے کی سیاست کا تو اُن کو پتا، کہا جاسکتا ہے

مولانا فضل حق خیر آبادی

مولانا فضل حق خیر آبادی اپنے زمانے کے ایک بڑے رئیس تھے اور اتنے بڑے عالم تھے کہ اسلامی فلسفے میں اُس زمانے میں دوچار آدمی ہی ان کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ عربی کے شاعر تھے اور اس میدان میں عرب تک میں اُن کا رول مانا جاتا تھا۔ لیکن اُنکی موت کا بے پانی کی ایک اندھیری کوٹھری میں ہوئی، کیونکہ اُنکو اپنے دیش سے محبت تھی اور اپنے دیش پر وہ کسی دوسرے کی حکومت برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔

بہت سے کارروں سے آج تک اس شہید کا نام اور زندگی کا حال روشنی میں نہیں آسکا۔ لیکن اب وہ زمانہ آگیا ہے، جب ہمیں اپنے اس بھگت شہید کو گناہی سے نکال کر اُسے وہ عزت دینی چاہئے جس کا وہ سچا حقدار ہے۔
خاندان کا حال — مولانا فضل حق کے بزرگ بہت پُرانے

زمانے میں ایران کے کسی صوبے پر حکومت کرتے تھے۔ کسی انقلابی طوفان میں اُن کی وہ حکومت اور شان و شوکت بہہ گئی اور اپنی جان بچانے کے لئے اُن کو ہندستان چلا آنا پڑا۔ اپنی عادت کے مطابق ہندستان نے اُن کو کلچے سے لگایا اور پھر اُن کے ذاتی پوتے کبھی کہیں، اور کبھی کہیں بستے اُٹھنے آخر خیر آباد ضلع سیتاپور میں آکر مستقل طور پر رہنے لگے۔ اپنی قابلیت سے

کے بل پر یہاں اُنھوں نے ایک اچھی جاگیر حاصل کی اور پھر اس پاس کے علاقے میں ایک بڑے رئیس سمجھے جانے لگے۔ رئیس رئیس ہونے پر بھی بھالت سے ہمیشہ دشمنی رکھی اور اپنے اونچے درجہ کی پڑھائی لکھائی اور بلند گیر کٹر کی پونجی ہی کو ہمیشہ اپنی پچھی جائیداد سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کی نظر میں بھی یہ خاندان آیا اور مولانا فضل حق کے دادا شاہی نوکری کے سلسلے میں خیر آباد سے دلی پہنچ گئے۔ اُن کے بعد مولانا فضل حق کے پتا مولانا فضل امام تو عالموں کی محفل کے چراغ سمجھے جاتے تھے۔ وہ دلی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے صدور الصدور یعنی سب سے بڑے بیج تھے۔ ساتھ ساتھ شوق اور فرض کے طور پر پڑھاتے بھی تھے۔ اُن کی لکھی عربی کی کئی کتابیں عربی لٹریچر میں آج بھی بہت عزت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔

مولانا کا جنم — مولانا فضل حق کا جنم سنہ ۱۷۹۷ء میں خیر آباد میں ہوا اور اُنکی بدورش دلی میں ہوئی۔ اُن کے خاندانی رواج کے مطابق چار سال کی عمر میں اُن کی تعلیم شروع ہوئی۔ مولانا کے پتا کو پڑھانے کا شوق تو تھا ہی۔ وہ شاہی دربار میں پاکی میں جایا کرتے تھے۔ اکثر فضل حق صاحب اُن کے ساتھ ہوتے تھے اور دربار کو آنے جانے میں جو سہ لگتا تھا، اُس کا اُپیوگ فضل حق صاحب کی پڑھائی میں ہوتا تھا۔ کچھ بڑے ہوئے تو ہندان کے مشہور انقلابی اور اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم شاہ عبدلنیز صاحب کے پاس پڑھنے کے لئے جانے لگے۔ ان کے سہرا بھی

تھے مفتی صدر الدین، آئندہ، جو ایک دوسرے رئیس کے بیٹے تھے۔ ان دونوں کے مزاج میں شوخی اور گرمی تو تھی، جیسی کہ اکثر رئیسوں کے بیٹوں میں پائی جاتی ہو لیکن شاہ عبدالعزیز کے مدرسے میں پہنچے تو وہاں ایک دوسرا ہی رنگ دیکھا۔ شاہ عبدالعزیز فقیر مہتمم کے آدمی تھے، اُن کا حال یہ تھا کہ جس دن فضل حق صاحب اور صدر الدین صاحب خود کتابیں لے کر آئے اُس دن سبق پڑھا دیتے تھے اور جس دن نوکر کتابیں لے کر آتا تھا، اُس دن پڑھانے سے انکار کر دیتے تھے۔ پھر بھی نیز ذہن ہونے سے ان دونوں کو وہ بہت پیار کرتے تھے۔ مولانا کی یادداشت بہت اچھی تھی اور فلسفے کی باریکیوں میں دماغ خوب چلتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۸۰۹ء میں صرف ۱۳ سال کی عمر میں اُنھوں نے اپنی پڑھائی پوری کر لی اور اپنے پتا کے شاگردوں کو پڑھانے لگے۔

اسی زمانے کی گھٹنا ہو، ایک بڑی عمر کے صاحب مولانا کے پتا کے پاس پڑھنے آیا کرتے تھے، لیکن جب فضل حق صاحب اپنی پڑھائی ختم کر کے خود پڑھانے لگے تو مولانا کے پتانے اپنے اس شاگرد کو بھی مولانا کے پاس ہی بھیج دیا۔ مولانا نے پہلے ہی دن جب اُنکو بیدار کیا اور کنداز ہو، دیکھا، تو جھنجھلا اُٹھے۔ کتاب پھینک دی اور کہہ دیا کہ یہ آپ کے بس کا روگ نہیں ہو، مہربانی کر کے کل سے تکلیف نہ کیجئے گا۔ اُس پردہ صاحب بہت زنجیدہ ہوئے اور اُنھوں نے تمام قصہ مولانا کے پتا کو سنایا۔ فوراً مولانا کی طلبی ہوئی اور جیسے ہی مولانا اپنے پتا کے سامنے پہنچے، اُنھوں نے ایک تھپڑ رسید کرتے

ہوئے کہا۔ ”بیوقوف! تو یہ نہیں سوچتا کہ تیرا جیسا دماغ سب کہاں سے پاسکتے ہیں؟ تو مالدار کا لڑکا ٹھہرا! کسی چیز کی کبھی کمی محسوس نہیں کی۔ جس کے پاس بیٹھا، اُس نے خاطر داری سے پڑھایا۔ ہمیشہ اچھا کھانے کو، اچھا پہننے کو ملا، لیکن ان بے چاروں کو یہ سب کہاں سے ملے؟“ مولانا نے اپنی غلطی محسوس کی اور پھر آئندہ کبھی کسی شاگرد پر ناراض نہیں ہوئے۔

سرکاری نوکری میں۔ جب کچھ اور بڑے ہوئے، تو انگریز رزیڈنٹ کی عدالت میں سرشتہ دار ہو گئے۔ بادشاہ اکبر شاہ اور رزیڈنٹ دونوں ہی مولانا کو بہت محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

سرکاری نوکر ہوتے ہوئے بھی مولانا نے پڑھانے کا سلسلہ قائم رکھا اور اس میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ اسی زمانے میں شاعری کا شوق ہوا، لیکن اردو، فارسی کو چھوڑ کر عربی میں شاعری کرتے تھے۔ مشہور شاعر مومن آپ کے شطرنج کے دوست تھے اور غالب صاحب کے ساتھ تو دن رات کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ مفتی صدر الدین صاحب سے بھی زندگی بھر نبھی۔ اس طرح نوکری اور پڑھانے سے جو دقت بچتا تھا تو شطرنج میں جاتا تھا یا شعر و شاعری اور لٹریچر کی چرچا میں۔ شعر کہنے کی ایسی مشق ہو گئی تھی کہ چار ہزار سے اوپر شعراؤں نے کہے ہوں گے۔ مولانا کی شاعری کا ایک بڑا حصہ اب لٹن لائبریری علی گڑھ یونیورسٹی میں آگیا ہو اور کچھ اب بھی ادھر ادھر پھیلے

ہوا ہے۔ ان کا کچھ کلام عرب تک بھی پہنچا اور اُس کو وہاں بڑی داد ملی۔ عربی زبان اور عربی شاعری پر مولانا کا اتنا قابو تھا کہ ایک بار اپنے استاد شاہ عبدالعزیز سے بھی اُچھ گئے۔ مولانا نے ایک قصیدہ شاہ صاحب کو سنایا۔ شاہ صاحب کو وہ پسند آیا۔ لیکن اس کے ایک شعر پر اُن کو اعتراض تھا۔ اس پر مولانا نے قریب بیس شعر مختلف مشہور شاعروں کے اپنی دلیل کی حمایت میں پڑھ دئے۔ شاہ صاحب نے اپنی غلطی منظور کی اور مولانا کو آشیرداد دے کر وداع کیا۔

کچھ دن بعد دکن میں ایک نیا رزیڈنٹ آیا، تو اُس نے اپنے محکمے کا ناظم مولانا کو مقرر کیا۔ سنہ ۱۸۲۸ء میں جب وہ دلائیٹ کے لئے چلا، تو مولانا مفتی بنائے گئے۔ لیکن اس کے بعد مولانا کی افسردہوں سے نہیں بچ سکی۔ اُس زمانے کے انگریز جیسی خوشامد چاہتے تھے، مولانا ویسی خوشامد نہیں کر سکتے تھے۔ اسی زمانے میں شاید مولانا کو پہلی بار غلامی کی پُرانی محسوس ہوئی اور انگریزوں کی نوکری اُن کو ذلت معلوم ہونے لگی۔

دلی سے باہر۔۔۔ اسی ناراضی کی وجہ سے مولانا کو سرکاری وکیل بنا کر الہ آباد بھیجا گیا۔ اُس زمانے میں بہار شاہ "ظفر" دلی عہد یعنی یو راج تھے۔ مولانا جب دلی سے جانے لگے، تو انھوں نے اپنا قیمتی سہاگ مولانا کو اڑھا دیا اور آنکھوں میں آسنو بھر کر وداع کیا۔ مولانا کچھ دنوں سرکاری وکیل کی حیثیت سے کام کرتے رہے، لیکن

انگریزوں کی طرف سے اب وہ بد دل ہو چکے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ہی دنوں بعد انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔

ریاستوں میں — مولانا کے استعفیٰ کی خبر جیسے ہی پھیلی، جھجر کے رئیس نواب فیض محمد صاحب نے پانچ سو روپیہ ماہوار پر فوراً مولانا کو اپنے یہاں بلا لیا۔ مولانا کچھ دن وہیں رہے۔ اس کے بعد اور چلے گئے۔ وہاں بھی جی نہ لگا تو سہارن پور پہنچے اور پھر ٹونک کے نواب وزیر الدولہ کے یہاں بھی کچھ دن تک رہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہو کہ مولانا اتنی ریاستوں میں اس لئے گھومے کہ انگریزوں کے خلاف ان کو لڑنے کے لئے آمادہ کر سکیں۔ لیکن ان رکیموں اور نوابوں کا خون سرد ہو چکا تھا، جس سے مولانا کو بڑی نراشا ہوئی اور پھر لکھنؤ میں آکر بڑے بیچ کے عہدے پر کام کرنے لگے۔

لکھنؤ میں اس وقت نواب واجد علی شاہ کی حکومت تھی لیکن دھیرے دھیرے انگریزوں کے پنجے میں یہ ریاست میں گستی چلی جا رہی تھی۔ نواب صاحب کو اپنی رنگ ریوں سے ہی فرصت نہیں تھی، پھر راج کا جی کاموں میں کون دماغ خرچ کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کا دل یہاں سے بھی اُوب گیا اور اچھی بھلی نوکری چھوڑ کر رام پور کی راہ لی، وہاں کچھ دنوں تک نواب یوسف علی کو پڑھاتے رہے۔ اسی زمانے میں یعنی ۱۸۵۵ء کے آس پاس نواب یوسف علی رام پور کی گدتی پر بیٹھے تو مولانا نے کوشش کر کے اپنے دوست نالک صاحب کی راہ رسم رام پور ریاست سے کرا دی

اور نواب صاحب غالب کے پاس اپنی غزلیں اصلاح کے لئے بھیجے گئے۔ اس کے بعد جب دہلی میں کچھ سرگرمی دکھائی دی اور بادشاہ کی طرف سے راجاؤں نوابوں کے پاس خط آنے شروع ہوئے۔ تو مولانا اور پہنچے اور انھوں نے راجا کو بادشاہ کا ساتھ دینے کے لئے سمجھایا۔ لیکن راجا کسی طرح راضی نہیں ہوا۔

آزادی کی لڑائی کے میدان میں۔ مولانا اب خاموش نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ وہ فوراً دہلی کی طرف چل دے اور راستے میں بڑے بڑے زمینداروں سے ملتے گئے اور ان کو یہ سمجھاتے گئے کہ اس وقت آزادی کی لڑائی میں حصہ لینے میں ہی ان کی بھلائی ہے۔ مولانا فضل حق مولانا احمد علی شاہ دلاور جنگ مدراسی سے بھی ملے، یہ مولانا احمد اسد فیض آبادی کے نام سے بھی مشہور ہیں اور اودھ کی بغاوت میں یہ جس بے اداری سے دس مہینے تک انگریزوں سے لڑتے رہے اُس نے اتنا ہی میں ان کا نام امر کر دیا ہے۔

دہلی میں۔ کچھ دن بعد مولانا کو معلوم ہوا کہ دہلی اب آزاد حکومت کے ہاتھ میں ہے تو وہ فوراً دہلی پہنچے اور بادشاہ سے ملے۔ شاہی دربار کے منشی جیون لال کے روڈناچے میں کئی جگہ مولانا کا ذکر ملتا ہے اور اُس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا برابر بادشاہ کے مشوروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔

لیکن اُس وقت دہلی کی جو حالت تھی۔ اُس سے مولانا کو بڑی تکلیف ہوئی۔ خود شاہزادوں کی بھی حالت یہ

تھی کہ دن رات لوٹ کھسوٹ پر انکی نظر رہتی تھی۔ گنڈے، بدعاشوں کی بن آئی تھی اور ناقابل لوگ بڑے بڑے عہدوں پر قبضہ کر کے بیٹھ گئے تھے۔

لیکن اس حالت میں بھی روہیلوں کی فوج، جس کا جہز بخت خاں تھا، نیچے دل سے اور نیچے جذبے سے لڑائی میں شریک تھی۔ اسی طرح بھروسے لائق ایک دوسرا سنگٹھن مجاہدوں کا تھا۔ جس کی باگ ڈور ولی اللہی مولویوں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ لوگ اکثر مولانا سے ملتے رہتے تھے۔ خاص طور پر جہز بخت خاں مولانا سے مشورہ کر کے ہی کوئی کام کرتے تھے، لیکن شاہزادہ مرزا منگل کے سامنے بیچارے بخت خاں کی لچھ چلتی نہیں تھی۔ کچھ دن بعد حالت یہاں تک بگڑی کہ مرزا الٰہی بخش نے بادشاہ سے کمپنی کے پاس معافی کا خط تک بھیجا دیا، لیکن انگریزوں نے اس پر بھروسہ نہیں کیا۔

آخر بخت خاں کے کہنے پر مولانا خود آگے بڑھے۔ جمعہ کی نماز کے بعد اُنھوں نے ایک لمبی تقریر جامع مسجد میں کی اور ایک فتویٰ پیش کیا، جس کے مطابق اس لڑائی میں شریک ہونا ہر ایک مذہبی آدمی کا فرض ہے۔

اس فتویٰ کا جاوہ جیسا اثر ہوا اور قریب نوے ہزار سپاہی بادشاہ کے جھنڈے کے نیچے آگئے۔ لیکن شاہی خاندان کے ہونے کے زعم میں جو لوگ تھے، انھوں نے اس کا کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ حالت یہ تھی کہ مرزا الٰہی بخش جیسے دغا باز کی پوچھ تھی اور سچے

وفا داروں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔ مولانا نے اپنی طرف سے کافی زور لگایا۔ لیکن بیچارے اکیلے کیا کرتے۔ آخر ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو کمپنی کی فوج نے دلی پر قبضہ کر لیا۔

خانہ بدوشی کی زندگی۔ دلی پر کمپنی کا قبضہ ہوتے ہی مولانا کے تمام ارمان مٹی میں مل گئے۔ اُس کے بعد جو خوں ریزی دلی میں ہوئی اُس نے ایک باریقامت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ دیا۔ مولانا نے جو فتویٰ دیا تھا اس کی خبر مغربوں کے ذریعے انگریزوں کو لگ چکی تھی اور مولانا کی بڑے زوروں سے تلاش کی جا رہی تھی۔ اسی حالت میں ۲۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو مولانا اپنے خاندان کو لے کر چپ چاپ دلی سے نکل گئے اور بھیکم پور ضلع علی گڑھ کے نواب صاحب کے یہاں پناہ لی۔ وہاں قریب ۱۸ دن رہے اس کے بعد نواب صاحب نے بھیکم پور سے قریب ۸ میل دور سانچک کے گھاٹ سے مولانا اور اُن کے خاندان کو بدایوں کی طرف اُتروا دیا۔

مولانا قریب دو سال تک ادھر ادھر خانہ بدوشی کی زندگی بتاتے رہے۔ لیکن کچھ ہی دن بعد ملکہ وکٹوریہ کا عام معافی کا اعلان ہوا اس پر مولانا ظاہر ہو گئے اور اپنے گھر خیر آباد میں جسا کر رہنے لگے۔

گرج قاری اور سزا۔ لیکن مولانا سرکاری فہرست کے اُن لوگوں میں تھے، جنکو معافی نہیں دی گئی تھی۔ اسلئے کچھ ہی دن بعد مولانا گرفتار کر لئے گئے اور لکھنؤ جا کر اُن پر مقدمہ چلایا گیا۔

مولانا نے خود ہی اپنی پیروی کی۔ ادھر نچ مولانا کا ایک پڑا شاگرد تھا اور مخبر پر بھی کچھ ایسا اثر پڑا کہ شناخت کے وقت اُس نے کہہ دیا کہ فتویٰ دینے والے فضل حق یہ نہیں ہیں۔ ان کو میں نہیں جانتا۔

اس طرح مولانا کے چھوٹنے کی پوری اُمید تھی۔ لیکن مولانا کو یہ جھوٹ گوارا نہ ہوا۔ اُنھوں نے اپنے آخری بیان میں کہا کہ مخبر نے کسی وجہ سے میری شناخت نہیں کی ہو، لیکن فتویٰ میں نے ہی دیا تھا اور آج بھی میری دہی رائے ہے۔

نچ اور گواہ حیران تھے اور گھر والے پریشان تھے، لیکن مولانا نے بات بدلنے سے انکار کر دیا۔ مولانا کو اُمید تھی کہ پھانسی کی سزا ملے گی، لیکن نچ نے رعایت کی۔ اور کالے پانی کی سزا دی۔ مولانا کی یہ ہمت دیکھ کر سب ذہک رہ گئے۔

کالے پانی میں — مولانا کالے پانی پہنچا دے گئے۔ وہاں اور بھی بہت سے مولوی تھے۔ اُنھوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا لیکن مولانا دہان دن رات تڑپتے رہتے تھے۔ کالے پانی میں لکھی ہوئی ان کی کتاب 'صورت الہندیہ' آنسوؤں کا ایک ہوتا ہوا چشمہ ہو۔ جس میں ایک ایک حرف میں مولانا کی تڑپ موجود ہو۔ یہ کتاب کپڑوں پر کونوں سے لکھی گئی اور بڑی مشکل سے ہندوستان تک آئی۔ مولانا نے اُس میں اپنی تکلیفوں کا جو نقشہ کھینچا ہو، اُسے پڑھ کر آج بھی جھرجھری آنے لگتی ہو۔

ادھر مولانا کی رہائی کی کوشش بھی ہو رہی تھی۔ آخر مولانا کے بیٹے شمس الحق رہائی کا پروانہ لیکر انڈین روانہ ہوئے اور ہماڑ سے اتر کر جب شہر میں گئے تو دیکھا کہ ایک جنازہ چلا آ رہا جس کے ساتھ بہت بھیڑ ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ کل ۱۲ صفر سنہ ۱۲۷۸ ہجری یعنی سنہ ۱۸۶۱ عیسوی کو مولانا فضل حق صاحب کا انتقال ہو گیا اور اب دفن کرنے کے لئے جایا جا رہا ہے۔ مسافرا اپنی آخری منزل پر پہنچ چکا ہے۔

مولوی احمد شاہ

۱۷۷۵ء کی ہندستان کی آزادی کی لڑائی کی بابت اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ لڑائی صرف اُن راجاؤں، نوابوں اور سامنتوں کی بناوت تھی، جکی جائیدادیں یا بھتے کمپنی کی سرکار نے ضبط کر لیے تھے۔ اسی لئے عام جنتا کا اس لڑائی میں کوئی حصہ نہیں تھا۔

کسی حد تک یہ بات ٹھیک بھی ہے، لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُس سامنت وادی زمانے میں بھی ہندستان میں کچھ ایسے دور اندیش بھگت موجود تھے، جنہوں نے اس کمزوری کو بھانپ لیا تھا اور عام جنتا کا پورا سہیگ لینے کی کوشش کی تھی۔ ایسے دور اندیش دیش بھگت ایتاؤں میں ایک خاص نام مولوی احمد شاہ کا ہے۔

مولوی احمد شاہ فیض آباد ضلع کے ایک بڑے زمیندار تھے، لیکن زمینداروں کی عیش پرستی اُن کو چھو بھی نہیں گئی تھی۔ اپنے اچھے چال چلن اور راج کا جی د مذہبی جانکاری کے لئے وہ علاقہ بھر میں مشہور تھے اور راجاؤں و نوابوں کے محلوں سے لے کر کسانوں کی معمولی جھونپڑیوں تک میں اُن کا نام بڑی عزت سے لیا جاتا تھا۔

مولوی احمد شاہ نہ تو صرف مذہبی کتابوں میں ہی ڈوبے رہنے والے مولوی تھے، اور نہ رعایا سے ٹیکس وصول کر کے اُس پر

گل چھڑے اڑانے والے زمیندار۔ ملک کی سیاست سے بھی اُن کو گری
 دلچسپی تھی اور اُن کو اس بات سے بڑا دکھ ہوتا تھا کہ انگریزوں کی
 طاقت ہندستان میں دھیرے دھیرے بڑھتی چلی جا رہی ہے اور کچھ
 اپنے بھائی سوارتھ دتھ ہو کر اپنے اس ملک کو غلام بنانے میں
 انگریزوں کی مدد کر رہے ہیں۔ وہ جب تب اپنے اس خیال کو ظاہر بھی
 کیا کرتے تھے۔ لیکن اُس زمانے میں عام جنتا کو سیاست سے کوئی
 دلچسپی نہیں تھی اور راجاؤں نوابوں کو ایسی باتیں سننے سے بھی ڈر لگتا تھا۔
 لیکن ۱۸۵۷ء میں جب لارڈ ڈلہوزی نے نہایت بے شرمی کے
 ساتھ اودھ کے علاقے کو کمپنی کے ادھیکار میں لے لیا اور نواب ابد علی
 شاہ کو قید کر کے کلکتے بھیج دیا گیا، تو مولوی احمد شاہ اسے برداشت
 نہیں کر سکے۔ اُنھوں نے سمجھ لیا کہ اس طرح ایک ایک کر کے ہر
 ایک نواب اور راجہ کے ساتھ اسی طرح کا برتاؤ ہوگا اور پورا دیش
 انگریزوں کے آدھین ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی مولوی صاحب
 نے یہ بھی محسوس کیا کہ آزادی کی لڑائی تب تک کامیاب نہیں
 ہو سکے گی، جب تک کہ اس دیش کی پوری جنتا اس میں
 حصہ نہ لے۔ اسی لئے نہ تو اُنھوں نے راجاؤں اور نوابوں کی
 ڈیوٹیوں کے چکر لگانے اور نہ ولی اللہی جماعت کے نیتاؤں
 کی طرح مسلمان جنتا ہی تک اپنے پرچار کو محدود رکھا۔ مولوی احمد شاہ
 نے ہندو مسلمانوں میں ایک ساتھ دیش کی آزادی کے نام پر انگریزوں
 کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا پرچار شروع کر دیا۔ ۱۸۵۷ء کی
 آزادی کی لڑائی کے دوسرے نیتاؤں اور مولوی احمد شاہ

میں یہی خاص فرق ہے، جو اُن کو کچھ زیادہ عزّت کا حق دار بنا دیتا ہے۔ کاش، کچھ اور نیتا مولوی احمد شاہ کا ساتھ دیتے، تو شاید خدمت کی لڑائی اس طرح سے اور اتنی جلدی ناکامیاب نہیں ہوتی۔

مولوی احمد شاہ کے پرچار کا ڈھنگ یہ تھا کہ وہ لکھنؤ سے آگرہ تک کے بیچ برابر دورے کرتے رہتے تھے اور دس دس ہزار آدمیوں کی بھیڑ اُن کی تقریر سننے کے لئے اکٹھی ہوتی تھی۔ مولوی احمد شاہ اُن کو بتلاتے تھے کہ انگریز کس طرح اس ملک میں بڑھتے گئے اور اگر پورا ملک اُن کے قبضہ میں چلا گیا تو اس کا نتیجہ عام جنتا کے لئے کیا ہوگا۔ اس طرح یہ تقریریں سو فیصدی سیاسی تقریریں ہوتی تھیں اور مولوی احمد شاہ کی زبان میں کچھ ایسا جادو تھا کہ کسی کسی گھنٹے تک یہ ہزاروں آدمی بت بنے ہوئے ملکی تقریریں سنتے رہتے تھے اور ملک کی بے بسی پر آنسو بہاتے رہتے تھے۔ اُس زمانے میں مولوی احمد شاہ شاید پہلے آدمی تھے جنہوں نے اپنے پرچار کا یہ طریقہ اپنایا تھا۔

اسی زمانے میں مولوی احمد شاہ نے بہت سی چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی لکھیں جو پڑھے سمجھے حلقے میں بڑی تعداد میں بانٹی گئیں۔ ان کتابوں میں بھی وہی بات تھی، جو مولوی صاحب کی تقریروں میں ہوتی تھی۔ اس طرح لاکھوں ہزاروں آدمیوں کے دل میں مولوی احمد شاہ نے دیش بھگتی کا سچا جذبہ پیدا کر دیا۔

اُس زمانے میں انگریزوں کے محبوں کا جال صرف راجاؤں، نوابوں کے راج و باروں اور محلوں تک ہی محدود تھا، اسلئے

مولوی احمد شاہ کا یہ کھلا پرچار بھی کچھ مہینوں تک اُن کی نظر میں نہ آسکا۔ لیکن جب آگ زیادہ بڑھی اور اُس کی لپٹیں انگریزوں کو بھی لگنے لگیں، تو اُنھوں نے مولوی احمد شاہ کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ اردھ کی پولیس نے انگریزوں کا یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر فوج بھیجی گئی اور مولوی صاحب گرفتار کر لئے گئے۔ اس کے ساتھ ہی ترنٹ مولوی صاحب کا مقدمہ بھی کر لیا گیا اور اُن کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ پھانسی کی تاریخ تک کے لئے مولوی صاحب کو فیض آباد جیل میں بند کر دیا گیا۔

مولوی احمد شاہ کی گرفتاری اور اُن کی پھانسی کی سزا کی خبر جنتا کو جیسے ہی ملی، ویسے ہی علاقہ بھر میں آگ سی لگ گئی۔ فیض آباد شہر میں اُس وقت دو پیدل پلٹن، کچھ سوار اور کچھ توپ خانہ تھا، جو اُس وقت تک انگریزوں کا پوری طرح وفادار تھا۔ لیکن مولوی احمد شاہ کی گرفتاری کی خبر پاتے ہی وہ دیش کے وفادار ہو گئے اور مولوی احمد شاہ ہندوں کو بھی کتنے پیارے تھے، اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مولوی صاحب کی گرفتاری کے درودھ میں سب سے پہلے ہتھیار اٹھانے والا ایک ہندو صوبے دار دیپ سنگھ تھا، جس نے فیض آباد کے تمام انگریز افسروں کو قید کر لیا اور فیض آباد کی آزادی کا اعلان کر دیا۔

اس کے بعد ہندستانی سپاہیوں اور جنتا کی ایک بڑی بھڑیل خانے پر پہنچی اور اُس نے دیوار توڑ کر مولوی احمد شاہ کو باہر

نکال لیا۔ مولوی صاحب کی بیڑیاں کاٹ ڈالی گئیں اور ختا و سیاہیوں نے اُن کو اپنا نیتا چُن کر اُن کی ہی ماتحتی میں کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح فیض آباد کے علاقے کی باگ ڈور پوری طرح مولوی صاحب کے ہاتھ میں آ گئی۔

اُس وقت مولوی صاحب نے جو پہلا کام کیا، اُس سے نہ صرف مولوی صاحب کا بلکہ پورے ہندستان کا سراو نچا ہوتا ہر۔ یہ کام تھا انگریز امینوں اور اُن کے بال بچوں کو پوری حفاظت کے ساتھ فیض آباد سے روانہ کرنا۔ یہ انگریز کشتیوں کے ذریعے فیض آباد سے روانہ کئے گئے اور راستے کے لئے اُن کو کافی رسد بھی دے دی گئی۔ جو لوگ کبھی پنجاب کے ہندوؤں پر ہونے والے ظلموں کا بدلہ پوربی پنجاب کے مسلمانوں سے لینا جائز بتاتے ہیں اور پوربی پنجاب کے مسلمانوں پر ہونے والے ظلموں کا بدلہ کبھی پنجاب کے ہندوؤں سے لینا ٹھیک سمجھتے ہیں، اُن کو مولوی احمد شاہ کے اس کارنامے کو آنکھ کھول کر پڑھنا چاہئے جنہوں نے اُن انگریزوں کی ہی حفاظت کی، جو اُن کو پھانسی کے تختے پر بھیج چکے تھے۔ انگریزوں کے ساتھ ٹھیک ہی برتاؤ مولوی احمد شاہ کے دوسرے ساتھیوں یعنی شاہ گنج کے تعلقدار راجہ مان سنگھ سالونی کے زمیندار سردار رستم شاہ اور کالا کے راجہ ہنومن سنگھ نے بھی کیا۔ انگریزوں کو فیض آباد سے نکال دینے کے بعد ورجن ۱۸۵۷ء کو یہ اعلان کر دیا گیا کہ فیض آباد کے علاقے سے کمپنی کی حکومت ختم ہو چکی ہے اور اب وہ واجد علی شاہ کی حکومت میں ہے۔ اس کے ساتھ ہی پورے

علاقے کا ایسا انتظام بھی کر دیا گیا، جس سے گنڈے اور شرارتی لوگ، جو ایسے ہی موقوف کی تلاش میں رہتے ہیں، سر نہ اٹھا سکیں۔

اس کے بعد جب لکھنؤ پر انگریزوں نے پھر گھیرا ڈالا، تو مولوی احمد شاہ اپنے ہزاروں سپاہیوں کے ساتھ لکھنؤ میں جا کر جم گئے۔ لکھنؤ شہر کے بھیتروں پر ۱۸۵۷ء سے لے کر مارچ ۱۸۵۸ء تک آزادی کی لڑائی برابر چلتی رہی اور مولوی احمد شاہ برابر اُس میں حصہ لیتے رہے۔ ۱۱ مارچ ۱۸۵۸ء کو جب کیمپبل کی فوج گورکھوں کی فوج اور پوربی جتے سے آنے والی انگریزی فوجوں نے لکھنؤ پر ایک ساتھ چڑھائی کی تھی اُس وقت بھی مولوی احمد شاہ لکھنؤ کے سینا پتوں میں ایک خاص حیثیت رکھتے تھے۔ فوج کو کمان کرنے کی ان کی قابلیت کتنی بڑھی چڑھی تھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے انگریز لیکچرر 'ہوس' نے لکھا ہے :-

”فیض آباد کے مولوی احمد شاہ ایک ایسا آدمی تھا، جو جذبات اور قابلیت دونوں کے لحاظ سے ایک بڑی تحریک کو چلانے اور ایک بڑی فوج کی کمان سنبھالنے کیلئے سب طرح سے یوگیا تھا۔“

لیکن ان دنوں ہی دلی کی طرح لکھنؤ میں بھی ہندوستانی نیتاؤں میں آپسی پھوٹ اور جلن پھیلنے لگی تھی۔ بجائے قابلیت کے اونچے حاکمان اور اونچی حیثیت کو ترجیح دی جاتی تھی اور ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں میں فوج کی کمان رہتی تھی۔

یہ آپسی پھوٹ اور جلن اتنی بڑھ گئی تھی، کہ ایک

بار لکھنؤ کی بیگم نے مولوی احمد شاہ کو گرفتار تک کر لیا، لیکن جب فوج اور جنتا کی طرف سے اس کا وردھہ ہوا تو مولوی صاحب چھوڑ دیئے گئے۔ اس سے مولوی صاحب کے دل کو دھکا تو لگا پر وہ دیش کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے الگ نہ ہوئے اور برابر رڑائیوں میں حصہ لیتے رہے۔ جتنی بار ہندوستانی سینا نے عالم باغ پر حملہ کیا، مولوی احمد شاہ گھوڑے پر یا ہاتھی کے اوپر ہمیشہ سب سے آگے لڑتے ہوئے دیکھے جاتے تھے۔

۵۔ ارجوری ۱۹۵۵ء کو مولوی احمد شاہ کے ایک ہاتھ میں گولی لگی۔ قریب ایک مہینہ تک وہ اسی وجہ سے چارپائی پر بڑے رہے۔ لیکن ۵ ارفوری کو وہ پھر میدان میں آکر جمع گئے۔ لیکن اب اپنے لوگوں میں ہی سیکڑوں فداں پیدا ہو چکے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۴ مارچ کو لکھنؤ پوری طرح انگریزوں کے ہاتھوں میں آگیا اور مولوی احمد شاہ، نواب برہیس قدر اور دیگر حضرات محل کے ساتھ شہر سے نکل گئے۔

مولوی احمد شاہ کے دل میں لکھنؤ چھوڑنے کا بڑا رنج تھا، اس لئے گھوڑے سے ساتھیوں کو لے کر ایک بار پھر مولوی صاحب لکھنؤ پہنچے، اور سعادت گنج محلے میں اپنا مویچہ جا دیا۔ اس وقت مولوی صاحب کے پاس صرف دو توپیں تھیں، پھر بھی وہ دیر تک انگریزوں کی بہت بڑی فوج کا جم کر مقابلہ کرتے رہے۔ لیکن آخر میں ان کو ہٹنا پڑا۔ انگریزی فوج نے چھ میل تک مولوی صاحب کا پیچھا کیا، لیکن وہ ان کو نہیں پاسکی۔ مولوی صاحب

پھر صاف نکل گئے۔

اس کے بعد مولوی صاحب لکھنؤ کے پچاس میل کے اندر انگریزوں کے خلاف برابر لڑائی چلاتے رہے۔ کچھ دن بعد وہ نانا صاحب کے ساتھ برلی جا پہنچے۔ کچھ ہی دنوں میں دتی اور اودھ کے کچھ اور نیتا اور اودھ کی بیگم حضرت محل بھی برلی جا پہنچیں۔ یہ خبر ملتے ہی سرکان کیمپل اپنی فوج کے ساتھ برلی جا پہنچا۔ نیتاؤں نے فیصلہ کیا کہ برلی سے نکل کر اور روہیلکھنڈ میں چاروں اور پھیل کر انگریزوں کے خلاف لڑائی جاری رکھی جائے۔ اسی فیصلہ کے مطابق مولوی صاحب نے برلی سے نکل کر شاہجاں پور پر مورچہ جمایا اور کچھ ہی دیر میں اُس پر قبضہ کر لیا۔ کیمپل پھر اپنی فوج کے ساتھ شاہجاں پور پہنچا اور ایک بار تو ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس بار مولوی صاحب انگریزوں کے پھندے سے نہیں بچ سکیں گے۔ لیکن مولوی صاحب کو گھرا ہوا دیکھ کر روہیلکھنڈ کے سبھی کرانتی کاری نیتا، نانا صاحب بیگم حضرت محل، شہزادہ فیروز شاہ اور راجہ تیج سنگھ وغیرہ اپنی اپنی فوجیں لے کر شاہجاں پور پہنچ گئے اور مولوی صاحب کو نکال لئے۔ یہ گھٹنا ثابت کرتی ہے کہ مولوی صاحب اُن نیتاؤں کی نظر میں کیا حیثیت رکھتے تھے۔

لیکن گھر کے خدازوں سے کون بچ سکتا ہے؟ مولوی صاحب دوبارہ اودھ پہنچے اور انگریزوں کے خلاف اپنا سنگٹھن کرنے لگے تو پون نام کی ایک چھوٹی سی ریاست کے راجہ جگننا تھ سنگھ نے

مولوی صاحب کو اپنے یہاں بلایا اور جب مولوی صاحب وہاں گئے تو راجہ کے ایک بھائی نے دھوکا دے کر اُن کو گولی مار دی۔ راجہ جگن ناتھ سنگھ نے فوراً مولوی صاحب کا سر کاٹ کر پاس کے انگریز کمپ میں پہنچا دیا، جس کے بدلے میں اسکو پچاس ہزار روپے انگریزوں سے انعام میں ملے۔ اس طرح ہرجون سہیلہ کو آزادی کی لڑائی کا ایک سچا دلکش بھگت نیتا ہمارے ہی دلوں کو گھات کے کارن مارا گیا اور اُس کی موت نے دوسرے نیتاؤں کو بھی بالکل پست ہمت کر دیا۔

مولوی احمد شاہ کے بارے میں مشہور اتھاس لیکھک مالین نے اپنی کتاب ”انڈین میوٹنی“ (ہندستان کا غدر) کی پہلی جلد، ص ۳۸۱ میں لکھا ہے۔

”مولوی بڑا عجیب آدمی تھا x x x سینا پتی کی حیثیت سے اُس کی قابلیت کے غدر میں بہت سے ثبوت ملے x x x کوئی بھی دوسرا آدمی گھمنڈ کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں نے دوسرے سرکارن کیمپس کو میدان میں ہرایا ہے! x x

x x اگر ایک ایسے انسان کو، جس کے دلش کی آزادی بے لاضانی کے ساتھ چھین لی گئی ہو، اور جو پھر سے اُس کو آزاد کرنے کی کوشش کرے اور اس کے لئے جنگ کرے، دلش بھگت کہا جاسکتا ہے، تو اس میں ذرہ بھر بھی شک نہیں ہے کہ مولوی احمد شاہ سچا دلش بھگت تھا۔ اُس نے کسی کی چُپ چاپ ہتیا کر کے اپنی تلوار پر کلنگ نہیں لگایا، نہ تھے اور بے قصور لوگوں کی ہتیا کو اس نے کبھی گوارا نہیں کیا اُس نے مردانہ وار، اُن کے ساتھ اور ڈٹ کر کھٹے میدان میں اُن بدیشیوں

کے ساتھ جنگ کی ، جنھوں نے اُس کا دیش بھین لیا تھا۔ ہر دیش کے ویر اور پتے لوگوں کو مولوی احمد شاہ کا نام عزت کے ساتھ لینا چاہئے۔“

یہ شبہ ایک انگریز کے ہیں ، جن کے خلاف مولوی صاحب لڑے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کتنے اونچے درجہ کے بہادر اور شان دار چال چلن کے انسان تھے۔ شہسلمہ کی تواریخ میں لاکھوں شہیدوں کے بیچ اُن کا نام ہمیشہ سورج کی طرح چمکتا رہے گا۔

مولانا برکت اللہ صاحب بھوپالی

ہندستان کے ان سیکڑوں ہزاروں دیش بھکتوں میں، جو دیش کی آزادی کے لئے اپنا گھر بار چھوڑ کر و دیش گئے اور پھر جیتے جی اپنے وطن کو نہ بوٹ سکے، مولانا محمد برکت اللہ صاحب بھوپالی کے نام اور کام کی چرچا ہمیشہ کی جاتی رہے گی اور وطن کی بھلائی کے لئے کام کرنے والے لوگ ہمیشہ اُن کی زندگی کے حالات سے روشنی اور ہمت پاتے رہیں گے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا برکت اللہ صاحب نے جس زمانے میں دیش بھکتی کی راہ میں قدم اُٹھایا، اُس زمانہ میں حالانکہ بہت سے لوگ ملک کی آزادی کے لئے کوشش کر رہے تھے اور اس کے لئے نہایت دلیری کے ساتھ طرح طرح کی تکلیفیں سہہ رہے تھے، لیکن اُن میں سے زیادہ تر لوگوں کی سیاست محض جذباتی تھی۔ ”ہندستان ہمارا، ہمارے پرکھوں کا دیش ہے، اس کی تہذیب اور اس کا پُرانا اتہاس بہت شان دار ہے، لیکن غلام ہونے کی وجہ سے اس کی پُرانی عزت و ہول میں مل گئی ہے، اس لئے ہم کو اپنے دیش کو آزاد کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔“ اُس وقت اکثر دیش بھکتوں کے خیالات ایسے ہی ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی اُن میں تھی کہ چونکہ اُن کی دیش بھکتی اپنے پچھلے شاندار زمانے کی یاد اور اُسے بھرسے حاصل کرنے کی خواہش پر قائم تھی، اس لئے اگر مسلمان

دیش بھکت مغلوں جیسا راج چاہتے تھے، تو ہندو دیش بھکت راجپوتوں جیسا یا مرہٹوں جیسا۔ ان دونوں میں حالانکہ کوئی آج بھی من مٹاؤ نہیں تھا اور نہ ان دونوں میں فرقہ پرستی ہی تھی، پھر بھی اپنے ان خیالات کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے کے نزدیک نہ آ سکے یہی وجہ ہے کہ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۱۵ء تک ہم ہندوستان کے ہندو اور مسلمان انقلابیوں کو صاف صاف الگ الگ صفوں میں پاتے ہیں۔ اُس وقت دیوبند کا مدرسہ اگر مسلمان انقلابیوں کا گڑھ تھا، تو ہمارا شٹر اور بنگال ہندو انقلابیوں کے گڑھ تھے۔ لیکن نہ تو ہمارا شٹر اور بنگال کے ہندو انقلابیوں میں کسی مسلمان کا نام پایا جاتا ہے اور نہ مدرسہ دیوبند کے کرائی کار یوں میں کسی ہندو کا ذکر ملتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اُس وقت جمہوریت یعنی پنجائیت راج کی بات ان لوگوں کے دماغ میں نہیں تھی۔ لہذا دونوں نے کبھی ایک ساتھ مل کر کام کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ حالاں کہ جب کبھی موقع آیا تب ان دیش بھکتوں نے ہندو مسلم ایکتا کی پوری کوشش کی۔ مثال کے لئے حاجی رشید احمد صاحب گنگوہی کا وہ فتویٰ اس سلسلے میں پیش کیا جاسکتا ہے، جو انھوں نے ۱۹۰۹ء میں دیا تھا اور جس میں مسلمانوں سے کہا گیا تھا کہ وہ کانگریس میں شامل ہوں، جو ہندو مسلمانوں کی ملی جلی جماعت ہے۔ لیکن سرسید کی، مسلم انجمن، میں، جو صرف مسلمانوں کی جماعت ہے، شریک نہ ہوں۔

لیکن اسی زمانے میں مولانا برکت اللہ صاحب بھوپالی نے

اس میدان میں آکر اس بڑی کمی کو پورا کر دیا، مولانا بھوپال کے رہنے والے تھے اور آپ کے پتا ریاست کے ایک بڑے سرکاری امسرتھے۔ اُنھوں نے اپنے لڑکے کو ادبچی سے ادبچی تعلیم پانے کے لئے ولایت بھیجا۔ اس طرح مولوی برکت اللہ صاحب بھری جوانی میں ولایت پہنچے۔ لیکن وہ ولایت پہنچ کر دوسرے ہندستانی قیدیوں کی طرح راس رنگ میں نہیں ڈوب گئے، بلکہ انگلینڈ پہنچتے ہی اُن کے دل میں یہ سوال اُٹھا کہ انگلینڈ جیسا چھوٹا ملک اتنا خوش حال کیوں ہے اور میرا دیش ہندستان اتنا دشال ہوتا ہوا اتنا غریب کیوں ہے۔ اُنھوں نے اس پر غور کرنا شروع کیا اور پھر اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندستان کی دل کو کنپا دینے والی یہ غریبی صرت اسلئے ہے کہ ہندستان پر انگریزوں کا قبضہ ہے۔ انگریزی حکومت جونک کی طرح ہندستان کا خون پی رہی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انگریز قوم اور اُن کا ملک موٹا اور مضبوط ہوتا جا رہا ہے جبکہ ہمارا دیش دنوں کزور اور بیمار پڑتا جا رہا ہے۔

اُس زمانے میں ہمارا شرط کے مشہور نیتا شری گوپال کرشن گوکھلے کا بڑا زور تھا۔ ”ہندستان کی مالی حالت کیسے بگڑی ہے؟ اس مضمون پر اُن کے بڑے زور دار جانکاری سے بھرے ہوئے لکچر ہوتے تھے، اس لئے شروع شروع میں مولانا برکت اللہ صاحب پر اُن کا بہت اثر پڑا۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد وہ اُن کی نرم نیستی سے اُوب گئے اور اُن کا جھکاؤ ملک پارٹی کی طرف ہو گیا۔ اس کے بعد مولانا ہندستان آ گئے اور اُنھوں نے بھوپال سے ایک اخبار

نکالنا شروع کر دیا۔ اُس زمانے میں جب کہ ولایت ہو آنا بہت بڑی بات سمجھی جاتی تھی اور ولایت کے پاس لوگوں کو بڑی سے بڑی نوکریاں ملنا بے حد آسان تھا، مولانا نے اس طرف نہ جا کر اپنے ملک کی خدمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا کی دیش بھکتی محض دکھاوٹی نہیں تھی۔ اُن کے دل میں سچ بیج اپنے ملک کے لئے بھاری درد تھا اور وہ اُس کے لئے بھاری سے بھاری قربانی کرنے میں بھی آگاہ پیچھا نہیں سوچتے تھے۔

مولانا کا یہ اخبار کچھ دنوں تک چلا، لیکن اُس کے گرم و چاروں کو زیادہ دن تک سرکار برداشت نہیں کر سکی۔ اخبار بند کر دیا گیا اور مولانا پر کڑی نظر رکھی جانے لگی۔ مولانا سمجھ گئے کہ اب وہ دیش میں رہ کر اپنے خیالات کا پرچار نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے وہ جاپان پہنچے اور وہاں کی ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گئے۔ یہیں سے اُنھوں نے 'اسلامک یونیورسٹی' کے نام سے ایک اخبار نکالنا شروع کیا۔

یہ اخبار سرسید کی اُن ہچلوں کی مخالفت کرتا تھا، جن سے ہندو مسلمانوں میں پھوٹ پڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ مولانا برکت اللہ صاحب کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کی بھلائی صرف اسی میں ہے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر انگریز حکومت سے مورچہ لیں۔

اس اخبار کی وجہ سے جب انگریز حکومت نے اپنے کام میں بادھا پڑتے دیکھی، تو اس نے جاپان سرکار پر اس کے خلاف

کارروائی کرنے کے لئے زور ڈالا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان کی حکومت نے اُس اخبار کو بند کر دیا۔ اخبار کے بند ہوتے ہی مولانا نے بھی اپنا بوسٹر سنبھالا اور جاپان سے چل دے۔ جس یونیورسٹی میں مولانا پروفیسر تھے، اُس کے منتظم نہیں چاہتے تھے کہ مولانا یونیورسٹی کو چھوڑ جائیں، لیکن مولانا نے رُکے پڑھانے اور پیٹ پالنے کے لئے اپنا وطن نہیں چھوڑا تھا۔ وہ جاپان سے سیدھے امریکہ پہنچے اور وہی اپنا پرانا کام شروع کر دیا۔ لیکن اُن کو یہ دیکھ کر بڑی تکلیف ہوتی تھی کہ اُن کے ملک کے مسلمان کچھ سوار تھی نیتاؤں کے بہکافے میں اگر آج اس بات پر بحث کرنے میں لگے ہوئے ہیں کہ کانگریس میں ملنا چاہئے یا نہیں۔ حالاں کہ اُس وقت کانگریس کی جو نرم پالیسی تھی، اُس کی وجہ سے مولانا کانگریس کو بھی کچھ زیادہ کام کی چیز نہیں سمجھتے تھے، لیکن اُن کا خیال تھا کہ یہ دیش کا ایک ملا جلا پلیٹ فارم ہے، جس کا اثر حکومت پر بھی کچھ نہ کچھ پڑتا ہی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا نے ۲۱ فروری ۱۹۰۷ء کو ایک خط مولانا حسرت موہانی صاحب کو لکھا تھا۔ یہ خط مولانا کی اُس وقت کی دچار دھارا کو پوری طرح ظاہر کرتا ہے، اس لئے اس کا کچھ حصہ یہاں دیا جاتا ہے۔ خط فارسی میں تھا، جس میں مولانا نے لکھا تھا:—

”حال ہی میں آپ نے ہندو مسلم ایکٹ پر جو ایڈیٹریل لکھا ہے اور انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ جلسے میں مسلمانوں کے شامل ہونے کے بارے

میں لکھنے کی جو مہربانی کی ہو، اُس کا انگریزی ترجمہ میں نے دیکھا بیدخوشی ہوئی۔ سب سے پہلی بات، جو ہندو مسلم اکیٹا کے لئے دیں بن سکتی ہو، دیش پریم اور ہم جنس (دوؤں کا ہندستانی ہونا) ہو۔ اصلیت تو یہ ہو کہ زیادہ تر مسلمانوں کے پُرکھے ہندو تھے اور ہندستانی تھے۔ اس لئے کچھ مذہبی ست بھید اُن کی اصلی اکیٹا کو ختم نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ ہندو مسلم اکیٹا کی سب سے بڑی ضرورت اس لئے بھی ہو کہ اس وقت دیش میں عام تباہی پھیلی ہوئی ہو۔

پچھلے دس برسوں میں قریب دو کروڑ انسان بھوکھ سے مرچکے ہیں۔ اور ان غریبی کے مارے ہوئے لوگوں میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ اس حادثے (درگھٹنا) کی بھینکرتا تب سمجھ میں آتی ہو جب ہم اس تعداد کا مقابلہ ایران کی آبادی سے کریں، جو صرف ڈیڑھ کروڑ ہو۔

آخر یہ غریبی کہاں سے آئی؟

(۱) جس وقت سے برٹش حکومت قائم ہوئی، انگریزی کارخانوں کے مالکوں نے مشینوں کے ذریعے کپڑا، ہتھیار، برتن وغیرہ بنا کر ہندوستان کی تمام کارگری کو دھول میں ملا دیا۔ ۱۸ ویں صدی کے آخر اور ۱۹ ویں صدی کے شروع میں انگلینڈ کی پارلیامنٹ نے یہ قانون بنایا کہ ہندوستان کی بنی ہوئی چیزیں جب انگلینڈ آویں گی، تو اُن پر کسٹم ڈیوٹی قریب ستریا اسی فی صدی لگے گی اور انگلینڈ کی بنی ہوئی چیزوں پر جو ہندوستان پہنچیں گی، یا تو کسٹم ڈیوٹی لگائی ہی نہ جائے اور اگر لگائی بھی جائے، تو بہت کم اور ہندوستان کی حکومت کا

خرچ چلانے کے خیال سے لگائی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی کاریگری دوسرے ملکوں میں گاہک نہیں پاسکی اور اپنے ہندوستان میں انگلینڈ کی چیزیں مستی ہونے کی وجہ سے خوب بکنے لگیں۔ اسی لئے دھیرے دھیرے ہندوستان کی تمام کاریگری جڑ سے ختم ہو گئی اور ہندوستان جو اپنے پرانے زمانے سے کلا کو شل کا گھر سمجھا جاتا تھا، صرف ایک کھیتی باڑی کا ملک بن کر رہ گیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی تمام اُدوج اور یہاں تیار ہونے والی چیزوں کو انگریز پونجی پتی بہت سستا خرید کر دوسرے ملکوں میں منگوا بیچتے ہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں کھیتی نئے طریقوں سے نہیں ہوتی۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت قریب تیس کروڑ روپیہ ہندوستان کی وزارت پر خرچ کرنے کے لئے، انگلینڈ کے پونجی پتیوں سے لئے ہوئے قرض کا سود چکانے کے لئے اور پرانے انگریز نوکروں کی پنشن دینے کے لئے ہر سال ولایت بھیج دیتی ہے۔ پانچویں وجہ یہ ہے کہ سب بڑے بڑے عہدے صرف انگریزوں کو دے جاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی نوکریاں ہی ہندوستان کو ملتی ہیں۔

چھٹی وجہ یہ ہے کہ قاون اور انڈین سول سروس کے امتحان دینے کے لئے ہندوستانیوں کو انگلینڈ جانے کے لئے مجبور کر دیا گیا ہے۔

یہ تھوڑے سے نقصان ہیں، جو ہماری بربادی کے اصلی کارن ہیں اور جن سے پورے ہندستان کی بربادی ہو رہی ہے۔ یہ نقصان میں نے بہت مختصر، یعنی کسی بڑے ڈمیرین ایک منٹھی کی طرح اس لئے بیان کئے ہیں، جس سے اُن لوگوں کو، جو کانگریس سے دور رہنا چاہتے ہیں، نصیحت حاصل ہو۔

اگر مسلمان کانگریس میں شامل ہو کر اس کش مکش کے میدان میں ناموری کی گیند اپنے ہندو بھائیوں سے آگے نکال لے جائیں تو وہ اسلام کی بہت بڑی خدمت کریں گے۔

یہ خط بتاتا ہے کہ مولانا برکت اللہ صاحب کی سیاست صرف جذباتی نہیں تھی، بلکہ اپنے کروڑوں لاکھوں دیش بھائیوں کی تکلیفیں اور غریبی ہی اُن کو اس میدان میں کھینچ لائی تھی۔

اس کے بعد ۱۹۱۰ء میں جب امریکہ میں غدر پارٹی کا سنگٹھن ہوا، تو مولانا اُس میں شامل ہو گئے۔ یہاں پر یہ بتانا ضروری ہے کہ غدر پارٹی کے تمام نیتا سکھ تھے، لیکن مولانا کو اُس میں شامل ہونا ضروری معلوم ہوا، کیوں کہ اُن کے نزدیک دیش بھکتوں کی ایک الگ قوم تھی، جس میں ہندو مسلمان، سکھ وغیرہ کا کوئی بھید ہی نہیں تھا۔ غدر پارٹی کے سکھ بھائیوں نے بھی اُن کو سرانگھوں پر بٹھایا اور آگے چل کر جب جب غدر پارٹی کے نیتاؤں میں چھوٹ پڑی، تب تب مولانا ہی ایک اکیلے ایسے آدمی رہے، جن پر غدر پارٹی کا ہر ایک ممبر پوری طرح یقین رکھتا تھا اور اُن کی بات مان لیتا تھا۔

۱۹۱۷ء میں جب یورپ میں بڑی لڑائی شروع ہوئی تو مولانا فوراً جرمنی پہنچے اور وہاں سے جو انڈو جرمن ٹرکش مشن افغانستان کے لئے چلا، اُس کے ایک ممبر بن کر ٹرکی ہوتے ہوئے افغانستان آگئے۔ یہ مشن اس لئے آیا تھا، جس سے کہ افغانستان کی سرکار کو اپنی طرف ملا کر ہندستان پر حملہ کر دیا جائے۔ یہیں پر مولانا برکت اللہ صاحب کی جان پہچان مولانا عبید اللہ صاحب سندھی اور مولانا محمد میاں صاحب کے ساتھ ہوئی اور وہ ہندستان کی اُس عارضی آزاد حکومت میں شامل ہو گئے، جو اُن لوگوں نے بنائی تھی۔ اس سرکار میں مولانا برکت اللہ صاحب کی حیثیت سب سے بڑے وزیر کی تھی۔

جیسا کہ سبھی جانتے ہیں کہ یہ حکومت افغانستان کی انگریز پست پالیسی کی وجہ سے کچھ زیادہ کام نہ کر سکی، اس لئے لڑائی ختم ہونے پر مولانا روس چلے گئے۔ وہاں آپ نے روس کی حکومت اور کمیونزم کی بابت پورے حالات سمجھے اور پڑھے، جس سے آپ کو ایک نئی روشنی ملی۔ لیکن بہت سی باتیں ایسی بھی تھیں، جن سے آپ روس کے نظریے سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ اُس لئے آپ روس سے لوٹ کر جرمنی آگئے اور وہاں سے 'الاصلاح' نام کا ایک اخبار نکالنے لگے۔ اس اخبار کا منشا بھی ہندستان کے مسلمانوں کو انگریزوں کے مقابلے میں کھڑا کر دینا تھا۔ یہ اخبار کچھ دنوں تک چلا، لیکن روپے پیسے کی تنگی کی وجہ سے آخر مولانا کو اسے بند کر دینا پڑا۔

فروری ۱۹۲۷ء میں جب بروسیس میں انٹی امپریلزم

کا نفرس، ہوئی تو آپ نے اُس میں غدر پارٹی کے سرکاری نمائندے کی حیثیت سے حصہ لیا۔ اس کا نفرس میں تمام دنیا کے نمائندے آئے تھے اور ہندستان کی کانگریس کی طرف سے اُس میں پنڈت جواہر لال نہرو نے حصہ لیا تھا۔ اُسی وقت آپ کی ملاقات نہرو جی سے بھی ہوئی تھی جس کا ذکر نہرو جی نے اپنی مشہور کتاب 'میری کہانی' میں اچھے لفظوں میں کیا ہے۔

اس کا نفرس کے بعد ہی سان فرانسسکو میں غدر پارٹی کا سالانہ اجلاس ہوا، جس میں آپ کو بہت اصرار کے ساتھ بلایا گیا۔ اُس وقت آپ کی صحت ایسی نہیں تھی کہ آپ اتنی دور کی یا ترا کر سکیں۔ پھر بھی آپ انکار نہ کر سکے اور وہاں پہنچے۔ اس اجلاس میں ہونے والی تقریر ہی آپ کی سب سے آخری تقریر تھی، جس میں آپ نے اپنے ساتھیوں سے برٹش حکومت کے خلاف برابر لڑنا چاہتے رہنے کی اپیل کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تقریر مولانا کی سب سے اچھی اور سب سے زیادہ کامیاب تقریر تھی، جس کے ایک ایک لفظ میں غضب کا جوش اور درد تھا۔ بہت سے لوگ تو اس تقریر کو سن کر رونے لگے تھے۔

غدر پارٹی کے اجلاس کے بعد ہی آپ بیمار پڑ گئے۔ اُس وقت آپ کی عمر پینسٹھ برس کی تھی، جس کے قریب ۲۲ برس آپ نے جلاوطنی کی حالت میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں بھاگتے دوڑتے بتائے تھے۔ اُس زمانے میں اُن کو جس حالت میں رہنا پڑا، اُس کی کہانی آج بھی پتھر سے پتھر

دل کو پگھلا سکتی ہے۔ پاس میں پیسہ نہیں، رہنے کو ٹھکانا نہیں، بالکل بیگانہ ملک، انگریزی حکومت کے جاسوسوں کا گھیرا اور ساتھیوں میں بھی آہنی پھوٹ۔ بھلا اس حالت میں کس کی ہمت قائم رہ سکتی ہے۔ لیکن مولانا جسے بھی ملے اور جب بھی ملے، ہلستے ہوئے ہی ملے۔ جب اُن کے اور ساتھی ان مصیبتوں اور پریشانیوں کی کڑواہٹ کی وجہ سے آپس میں لڑتے تھے، اور ایک دوسرے پر بُرے سے بُرے الزام لگانے لگتے تھے، تب اُن کو سمجھانا اور دھیرج بندھانا مولانا ہی کا کام تھا۔ وہ کبھی اپنی مصیبتوں کی بات زبان پر بھی نہیں لاتے تھے اور اپنے ہر ایک ساتھی کی مصیبت سننے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر ایک حلقے میں وہ بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

کچھ لوگ اُن کو پچھڑے ہوئے خیالوں کا بھگتے تھے۔ کیوں کہ اُن کی ہر بات کچھ روحانیت کا رنگ لائے ہوئے ہوتی تھی، باوجود اس کے کہ وہ تمام یورپ گھوم آئے تھے اور روس میں بھی کافی دنوں تک رہے تھے، خدا اور مذہب پر اُن کا دشواں دنوں دن پکا ہوتا گیا۔ شاید ہی کبھی اُنھوں نے ایک وقت بھی نماز چھوڑی ہو اور شاید ہی کسی رمضان میں ایک دن بھی بنا روزہ رکھے رہے ہوں۔ پھر بھی اور شاید اسی لئے وہ ہندو مسلمانوں کی ایکتا پر دل سے یقین رکھتے تھے اور اُن کو آپسی پھوٹ سے اتنی نفرت اور چڑھ تھی کہ صرف اس بارے میں وہ کسی کو بھی کبھی معاف نہیں کر سکتے تھے۔

اپنی اُس آخری بیماری کے وقت بھی اُن کی غریبی کی حالت یہ تھی کہ اُن کا بستر ایک چھوٹی سی کوٹھری میں تھا، جس میں فریج کے نام پر ایک میز تک نہیں تھی اور دو ایسا ڈاکٹر کا نوڈر کرنا ہی فضول ہوگا۔ اس حالت میں ہمارے دلش کی آزادی کی لڑائی کا یہ سورما اپنی آخری راتیں تبارہا تھا لیکن پھر بھی اُن کے چہرے کی مسکراہٹ چھپنی نہیں جاسکتی اور ستمبر ۱۹۲۷ء کے اُس دن جب اُنھوں نے ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں، تب بھی اُن کے چہرے پر وہی مسکراہٹ بنی رہی۔

مرنے وقت اُنھوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا: ”تمام زندگی میں ایمانداری کے ساتھ اپنے وطن کی آزادی کے لئے کوشش کرتا رہا۔ میری یہ زبردست خوش قسمتی تھی کہ میری یہ ناچیز زندگی جس وطن کے کام آئی۔ آج اس زندگی سے بدایلتے سے جہاں مجھے یہ انوس ہو کہ میں اپنی کوششوں میں ناکامیاب رہا، وہاں مجھے اس بات کی بھی تسلی ہو کہ میرے بعد میرے ملک کی مدد کرنے کے لئے آج لاکھوں آدمی آگے بڑھ رہے ہیں۔ جو بچے ہیں، بہادر ہیں، جاں باز ہیں۔ میں اطمینان کے ساتھ اپنے ملک کی قسمت اُن کے ہاتھوں میں سونپ کر جا رہا ہوں۔“

یہ اُس شہید کے آخری لفظ تھے جو اس دُنیا نے سُننے اس کے بعد تو صرف اُن کی یاد ہی باقی رہ گئی۔

مولانا محمد بکرت اللہ کی زندگی کے یہ تمام حالات معلوم ہونے پر کبھی کبھی دل میں خیال ہوتا ہے کہ کاش وہ آج بھی ہوتے اور آزاد

ہندستان میں کچھ ہی دن بتا لیتے لیکن پھر خیال آتا ہے کہ اُن کا آج نہ ہونا بھی اچھا ہی ہے۔ کیوں کہ اگر وہ آج ہوتے، تو یا تو پاکستان کے کسی جیل میں ہوتے کیوں کہ وہ ہندو مسلم ایکٹا کے حامی تھے اور یہ بربادی اور آپس کی نفرت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اور اگر وہ ہندستان میں رہتے تو اُن کے اسی ملک کے بچے اُن کے ہندستان میں رہنے پر اعتراض کرتے اور اُن کی وفاداری پر کوئی ایسے صاحب شک کرتے نظر آتے، جن کی پوری عمر برٹش حکومت کے تلوے پہلانے میں مینٹی ہوتی۔ اس لئے یہ اچھا ہی ہوا کہ وہ آج ایسی جگہ ہیں، جہاں اُن سے وفاداری کا حلف اُٹھانے کے لئے کہہ کر ہم اُنکا پیمانہ نہیں کر سکتے۔ ہائے رے بد قسمت ہندستان۔

مولانا منظر الحق

ہمارے دیش میں آج فرقہ پرستی کا زہرا تھن بڑی طرح پھیل
یا ہے، کہ آج زیادہ تر ہندو ہر ایک مسلمان کو منک اور نفرت کی نگاہ
سے دیکھتے ہیں اور زیادہ تر مسلمان ہر ایک ہندو کو اسی نگاہ سے دیکھتے
ہیں۔ جن لوگوں کی پوری زندگی ہماری جانکاری میں ہی دیش سیوا میں
تھی اور جن کو ہم نے ہمیشہ فرقہ پرستی کے خلاف آواز اٹھاتے اور
س کے عوض میں اپنی ہی جاتی بھائیوں کے پتھر کھاتے دیکھا ہے، ہمارے
ل کی شیطانت آج ہمیں اُن کے اوپر بھی یقین نہ کرنے اور اُن کو
بادشمن ماننے کے لئے بھڑکاتی ہے۔ یہی کارن ہے کہ آج بھی نہ جلنے
نیتے مسلمان چھپے چھپے اور گپ چپ پنڈت جو اہر لال نہر د پر
ی ٹنک کرنے سے نہیں چوکتے اور ہندو تو کھلم کھلا مولانا آزاد
شیخ احمد قذوائی اور شیخ عبداللہ تک کے بارے میں اسی طرح
زہریلی باتیں کہتے دیکھے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ ضرفعی
علوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے ان بزرگوں کی یاد کریں، جنھوں نے
پنی پوری زندگی ہی دیش سیوا اور آپسی میل ملاپ
م کرنے میں لگادی۔

ایسے لوگوں میں ایک خاص نام مولانا منظر الحق صاحب کا ہے،
ہمارے ایک بہت بڑے رئیس گھرانے میں پیدا ہو کر بھی اپنی
نی بھکتی کے کارن سب کچھ تیاگ کر فیروں کی طرح رہنے لگے۔

تھے۔ جو فرقہ پرست ہندو آج یہ پرچار کرتے پھرتے ہیں کہ ہندوستان کا کوئی مسلمان کبھی سچا دلش بھکت نہیں ہو سکتا اور نہ وہ اپنے جاتی بھائیوں کے بارے میں اپنا پیش پات ہی چھوڑ سکتا ہے، اُنکے لئے مولانا منظر الحق صاحب کی زندگی ایک ایسا بھرپور اور سچا جواب ہے، جس سے کسی طرح بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

مولانا منظر الحق صاحب لندن میں گاندھی جی کے ساتھ پڑھے تھے اور وہیں سے میر سٹری پاس کرنے کے بعد وہ جیسے ہی دلش لوٹے دلش کے کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ کانگریس دھیرے دھیرے طاقت ور ہوتی جا رہی تھی اور اُس نے برٹش حکومت اور اُسکے انصاف کی سرپٹا کرنے کے بجائے کچھ دبی دبی زبان سے سوراخ اور آزادی کی بات کرنی شروع کر دی تھی۔ ہمارے دلش کے انگریز افئیر کانگریس کے اس بدلتے ہوئے رویے کو دیکھ کر بید ڈرنے لگے تھے اور بہت سوچ بچار کرنے کے بعد انھوں نے کانگریس کی طاقت کو کم کرنے کے لئے ہندو مسلمانوں میں بھوٹ ڈالنے کا اُپلے کھونچ نکالا تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ مسلمانوں میں پہلے تو یہ خیال پیدا کیا جائے کہ وہ ہندوستان میں ہندوؤں کے مقابلے میں کم تعداد میں ہیں اور اس لئے ان کو ہندوؤں کے حملوں سے بچنے کیلئے کچھ خاص غایلوں کی ضرورت ہے اور اُس کے بعد اُن کو یہ رعایتیں کچھ ایسے ڈھنگ سے دی جائیں، جس سے ہندو اُن رعایتوں کا وردھ کریں، اور مسلمانوں کا یہ خیال یقین میں بدل جائے کہ سچ مچ ہندو ہمارے دشمن ہیں اور وہ ہماری برہمتی کو سہن نہیں کر سکتے۔

اس کے لئے سنہ ۱۹۰۹ میں منٹو مارے ریفرم کے نام سے ایک اسکیم ہندستان پر لاگو کی گئی، جو ہندستان کی ناگوں کا ایک کھجلاہٹ بھرا جواب تھا۔ اس منٹو مارے ریفرم میں مسلمانوں کی بڑی طرفداری ظاہر کی گئی تھی، لیکن وہ طرفداری اس شکل میں نہیں تھی کہ غریب مسلمان بچوں کے لئے سستی تعلیم کا کوئی انتظام کیا گیا ہو، یا ان کے لئے اسپتال کھولے گئے ہوں، یا سرحد پر، جہاں کہ سو فیصدی مسلمان رہتے تھے، انگریزی حکومت کے ویشیانہ حملے بند ہو گئے ہوں، بلکہ وہ طرفداری اس شکل میں تھی کہ اسمبلی اور کونسل کے چناؤ میں ووٹ دینے کا حق پانے کے لئے ایک ہندو کے لئے تو یہ ضروری تھا کہ یا تو اس کی آمدنی تین لاکھ روپیہ سالانہ ہو اور یا وہ کم سے کم تیس سال پرانا گریجویٹ ہو۔ لیکن مسلمان کے لئے صرف تیس ہزار کی آمدنی اور تین سال پرانا گریجویٹ ہونا ہی کافی تھا۔ دنیا بھر میں یہ شاید پہلا موقع تھا، جب کہ ووٹ دینے کے حق کے معاملے میں جاتی یا فرقے کے نام پر اس طرح فرق کیا گیا تھا۔

جیسے ہی یہ اسکیم شائع ہوئی، پورے ہندستان میں اس کے سلسلے پر ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا۔ خوش قسمتی سے اس زمانے کی عام جنتانہ تو آج کی طرح مہذب ہی تھی اور نہ اس کا سیاست کے اتنا سیدھا تعلق ہی تھا، اس لئے پھرے بازی تو نہیں ہوئی، پراخاروں میں کالم پر کالم رنگے گئے، بڑی بڑی سمجھائیں اس کی مخالفت اور موافقت میں کی گئیں اور اس نے ہندو مسلمانوں کے سوال کو کافی ابھار دیا۔ ہندو کہتے تھے

کہ دوٹ دینے کے حق کے بارے میں اس طرح بھید بھاؤ کرنا ہمارے ساتھ سراسر ظلم کرنا ہے اور مسلمان کہتے تھے کہ جب انگریز تک یہ مانتے ہیں کہ گنتی میں ہونے کی وجہ سے ہمارے ساتھ یہ رعایت کرنا ضروری ہے، تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ ہمارا بچا حق ہے اور کانگریس و دوسرے ہندو نیتا اپنی فرقہ پرستی کی وجہ سے ہی اس اسکیم کا رد دے کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں کسی مسلمان نیتا کا اس اسکیم کی مخالفت میں ہونا کتنی بڑی ہمت کی بات تھی، یہ بات آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن مولانا منظر الحق صاحب نے اس اسکیم کا جم کر رد دے کر اور انھوں نے ان مسلمان فرقہ پرست نیتاؤں کو جو انگریزوں کی اس بھیانک چال کو اپنی کامیابی سمجھ کر خوشی سے بغلیں بجا رہے تھے، بہت صاف صاف لفظوں میں یہ چیتا دنی دی کہ اس اسکیم کو منظور کر کے وہ پھوٹ کا ایسا بیج بوئے دے رہے ہیں، جس کا درخت آگے چل کر بہت بڑے پھل دے گا۔ جیسا کہ فرقہ پرست گروہوں کا قاعدہ ہوتا ہے اس موقع پر منظر الحق صاحب کو کافی گالیاں ان کی طرف سے سنائی گئیں، لیکن وہ ان باتوں سے ڈرنے والے نہیں تھے۔ کاش! اُس وقت ہی اپنے اس دور اندیش نیتا کی آواز پر اس بد قسمت ملک نے دھیان دیا ہوتا۔

اس کے بعد کانگریس کی مانگوں کو انگلیشنڈ کی جتنا کہ سامنے رکھنے کے لئے سنہ ۱۹۱۴ء میں جب ایک ڈیپوٹیشن انگلیشنڈ بھیجا گیا، تو اس میں مولانا منظر الحق صاحب بھی تھے۔ اس ڈیپوٹیشن میں شری سچاند سہنا، بھوپیندر نا بھٹہ، بسو، مسٹر جٹا، لالہ لاجپت سنگھ

وغیرہ اُن کے ساتھی تھے اور وہاں پر اُنہوں نے جس محنت کے ساتھ اپنے کام کو نبایا، اُس کی سبھی لوگوں نے داد دی لیکن وہ جلدی ہی سمجھ گھٹے کہ اس طرح کے ڈیپوٹیشنوں سے کبھی کوئی عملی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اُس کے بعد اس زمانہ کی برل سیاست سے اُنکی طبیعت اُدب سی گئی اور وہ کچھ زیادہ کارگر پروگرام پر زور دینے لگے۔ کچھ دنوں بعد سنہ ۱۹۱۶ میں جب ہامتا گاندھی چھپارن کے نلے گوروں کے اتیا چاروں کی جانچ کرنے کے لئے بہار پہنچے، تو مولانا منظر الحق صاحب سے اُن کو کافی مدد ملی اُس زمانے میں گاندھی جی کو مدد دینا تو دور اُن کو اپنے گھر میں ٹھہرانا بھی بڑی ہمت کی بات سمجھی جاتی تھی، لیکن منظر الحق صاحب جس کام کو ٹھیک سمجھتے تھے اُس کے کرنے میں پھر مصیبتوں اور پریشانیوں کا سوال اُنکو اپنے راستے سے کبھی ایک انچ بھی نہیں ڈگا سکتا تھا۔ اس لئے جب چھپارن میں کام کرتے ہوئے ایک بار گاندھی جی نے اپنے ساتھیوں سے یہ پوچھا کہ اگر اس سلسلے میں جیل جانے کی ضرورت ہوئی، تو کون کون اس کے لئے تیار ہے۔ تب مولانا منظر الحق پہلے آدمی تھے۔ جنہوں نے جیل جانے والوں میں اپنا نام دیا تھا۔ اس زمانے میں جیل جانا ایک ایسی غیر معمولی بات سمجھی جاتی تھی کہ جب گاندھی جی نے یہ سوال لوگوں کے سامنے رکھا، تو سبھی اُن کے ہرے کی طرف دیکھتے رہ گئے تھے۔ لیکن مولانا نے جب اپنا نام پیش کیا، تو اور بھی بہت سے لوگوں نے اپنا نام لکھا دیا۔ اس لئے گاندھی جی نے جیل جانے والوں کی پہلی

ڈلی کا صدر مولانا کو ہی چنا تھا۔

اس کے کچھ دن بعد ہی یعنی سنہ ۱۹۱۷ء میں بہار کے شاہ آباد ضلع میں اور اس کے بعد گیا اور پلا مو ضلعوں میں بھی گائے کی قربانی کے مسئلے پر بہت بڑے بڑے ہندو مسلم دنگے ہوئے۔ ان ضلعوں میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی، اس لئے جیسا کہ راجندر بابو نے اپنی ”اتم کتھا“ میں لکھا ہے، مسلمانوں کو ہندوؤں کے ہاتھوں جان اور مال کا بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ اُس وقت مولانا منظر الحق صاحب کی حیثیت کا کوئی دوسرا لیڈر ہوتا، تو یقیناً اس کی طبیعت پر ان واقعات کا اثر پڑتا اور اُس کے دل میں ہندوؤں کی طرف سے کڑواہٹ پیدا ہو جاتی لیکن مولانا جانتے تھے کہ اس بد سمت ملک میں اس طرح کے فرقہ دارانہ جھگڑوں کی اصلی وجہ دوسری ہی ہے، اس لئے اُنہوں نے اگر مصیبت زدہ مسلمانوں کی مدد کی، تو جو ہندو بلوے کے بعد پولیس اور فوج کی زیادتیوں کے شکار ہوئے، اُنکی مدد کے لئے بھی مولانا کے دروازے ہمیشہ کھلے رہے۔ انسان انسان میں بھیید کرنا اُنکو کبھی نہیں سہانا تھا اور اسے وہ بہت ذلیل بات سمجھتے تھے۔

اس کے بعد اسپوگ اندون شروع ہوا۔ گاندھی جی نے دکیوں سے، سرکاری نوکروں سے اور دیار حقیوں سے سب کچھ چھوڑ چھوڑ کر آزادی کی لڑائی میں حصہ لینے کے لئے کہا اور اس پکار کو سنتے ہی مولانا منظر الحق صاحب اپنا سب کچھ تیاگ کر آزادی کی لڑائی کے میدان میں آڈٹے۔ اس سلسلے میں اُنہوں نے جو تیاگ کیا، اُس کی کہانی آج بھی دل میں ایک آئینہ

راجندر بابو نے اپنی 'اٹم کتھا' میں لکھا ہے کہ جب ایک دن انجینئرنگ اسکول کے کچھ دوپار تھی وہاں کے پرنسپل سے جھگڑ کر اسکول سے نکل آئے، تو وہ ایک جلوس کی شکل میں مولانا کے پاس پہنچے اور ان سے کہا کہ ہم لوگوں نے اسکول تو چھوڑ دیا ہے، اسلئے اب آپ ہم کو کوئی جگہ دیجئے۔ اُس وقت مولانا بہت ہی عیش و آرام کے ساتھ ایک بڑی کوٹھی میں رہا کرتے تھے اور اپنے لئے ایک دوسری کوٹھی بھی بنوا رہے تھے، لیکن جب ان پھول سے فوجانوں کو جبکہ کسی تلاش میں اس طرح بھٹکتے دیکھا، تو ان سب لڑکوں کو لے کر اپنی جان پہچان کے ایک صاحب کے چھوٹے سے بنگلے میں آکر رہنے گئے، جو گنگا کے کنارے پر بنا ہوا تھا۔ اُن دنوں کڑا کے کی سردی پڑ رہی تھی اور گنگا کے کنارے پر ہونے کی وجہ سے وہ جگہ اور بھی زیادہ ٹھنڈی تھی۔ اس کے علاوہ گھنے باغیچوں سے گھرے رہنے کے کارن وہاں سیل بھی تھی۔ لیکن مولانا وہیں جھے رہے۔ کچھ دنوں بعد مولانا نے اپنے ہی پیسے سے وہیں کچھ مکان بھی بنوا دیے اور اُس جگہ کا نام 'صداقت آشرم' رکھ دیا، جو تب سے لیکر آج تک صوبہ کانگریس کمیٹی کا صدر دفتر بنا ہوا ہے۔ اس آشرم میں مولانا نے چرخہ بنانے کا ایک کارخانہ بھی کھولا اور بھی لڑکوں کو اس کام میں لگا دیا۔ وہ خود لڑکوں کو پڑھاتے بھی تھے اور وہی سادا کھانا کھاتے تھے، جو لڑکے کھاتے تھے۔ لڑکے زیادہ تر ہندو تھے لیکن مولانا کو وہ پتا کی طرح پوجیہ مانتے تھے اور اُن پر بھروسہ کرتے تھے۔ مولانا صاحب نے بھی

اُن کے اس بھروسے کو کس طرح بنایا، اس کا پتہ نیچے کی گھٹنا سے لگتا ہے، جسے راجندر بابو نے اپنی 'آئینہ گھٹنا' میں اس طرح لکھا ہے۔

”حق صاحب کے ساتھ ایک بہت غریب گھر کا لڑکا رہا کرتا تھا۔ اُنھوں نے دیکھا تھا کہ لڑکا پڑھنے میں تیز ہے۔ اُنکے دل پر اس کا بھی اثر پڑا تھا کہ مسلمان ہو کر بھی اُس نے ہندی اور سنسکرت پڑھی تھی۔ وہ کالج کے فرسٹ ایر یا سکنڈ ایر میں پڑھتا تھا۔ ہم تھا اس کا محمد خلیل، حق صاحب اُسے مانتے تھے۔ اسیوگ کریمہ ہونے پر اُس نے بھی کالج چھوڑ دیا، اور حق صاحب کے ساتھ ہی اُنکی کوٹھی چھوڑ کر صداقت آشرم میں جا کر رہنے لگا۔ ایک ڈیڑھ سال بعد میں نے سنا کہ حق صاحب نے اُس کو نکال دیا۔ محمد خلیل نے بھی اگر مجھ سے کہا کہ وہ رنج ہو گئے ہیں آپ سفارش کر کے اُنکوشات کر دیجئے۔ حق صاحب کی ہر بانی میرے اوپر برابر رہا کرتی تھی، وہ دل سے مجھے پیار کرتے تھے۔ اس لئے میں نے محمد خلیل کے بارے میں اُن سے کہا، اُس سے تک محمد خلیل سارے بہار میں دکھیات (مشہور) ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے اسیوگ کریمہ ہوتے ہی ایک راشنریہ بھیجنا بنایا تھا، جو اُن دنوں بہت چالو ہو گیا تھا.... اُن دنوں شاید ہی کوئی ایسی سمجھا ہوتی تھی، جس میں یہ گیت اُتساہ سے نہ گایا جاتا ہو۔

”جب میں نے حق صاحب سے کہا کہ محمد خلیل کی کوئی غلطی ہو تو معاف کیجئے۔ تو اُنھوں نے بہت ہی دُکھ کے ساتھ مجھ سے کہا، ”میں تمھاری بات کبھی نہیں مانتا، پر اس سے مجبور ہوں۔ تم نہیں جانتے کہ خلیل نے کتنا بُرا کام کیا

ہو، اس لئے تم سفارش کر رہے ہو۔ میں نے جس چیز کو اپنے سارے
 جیون کا مکھیہ ادیش (خاص مقصد) بنایا ہے۔ جس کے لئے سب
 کچھ کرتا آیا ہوں اور کج فقیروں کا ہوں، اُس پر اس نے ٹھیس
 لگائی ہے۔ میں نے اپنی ساری زندگی میں ہندو مسلم ایکتا کے لئے
 کام کیا ہے۔ اُسی میں کج بھی لگا ہوا ہوں۔ آشدھم میں رہ کر
 اُس نے ہندو لڑکوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا ہے، جس سے
 وہ لڑکے، جو مجھ پر دشو اس کر کے پریم دش میرے پاس آگئے
 ہیں، ہندو مسلم بھید بھاؤ سمجھنے لگے۔ اُس نے میرے سارے
 جیون کے سب سے بنائے کام کو بگاڑنے کا جتن کیا ہے۔ اس نے اس
 بات کی کوشش کی ہے کہ لڑکوں کو مسلمان بناوے۔ میں سب کچھ معاف
 کر سکتا ہوں، پر اس طرح اسلام کے نام پر لڑکوں کے ساتھ دشو اس
 گھات کرنا برداشت نہیں کر سکتا۔ اب میں جان گیا ہوں کہ اُس نے
 ہندی اور سنسکرت بھی اسی ڈھونگ کیلئے پڑھی ہے۔ ایک دن یہ ہندو مسلم
 فساد بھی کرادینگا۔ میں اسے آشرم میں جبرگزیں نہیں رہنے دوں گا۔
 اس طرح اُنھوں نے اُس محمد خلیل کو، جسے اُنھوں نے اپنے
 بیٹے کی طرح پالا پوسا تھا اور جس کی پڑھائی لکھائی میں ہزاروں
 روپیہ خرچ کیا تھا، اس الزام پر کہ اُس نے کسی ہندو لڑکے کو
 مسلمان ہونے کے لئے پھسلایا تھا، اس طرح گھر سے نکال دیا کہ پھر
 زندگی بھر اُس کا منہ نہیں دیکھا۔ صرف اسی ایک گھٹنا سے یہ
 معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ہندو مسلم ایکتا پر کتنی سچائی سے یقین کرتے
 تھے اور اسے کتنی اہمیت دیتے تھے۔

ایک خاص بات یہ تھی کہ گاندھی جی کی ہی طرح مولانا بھی کبھی یہ نہیں دیکھتے تھے کہ انکی ان بجاؤ ناؤں کا ہندوؤں پر کیا اثر پڑتا ہو۔ اُن کے نزدیک ہندو مسلم ایکٹا کا کام دوکانداری نہیں تھی، جس کا عوض کچھ نہ کچھ ملنا ہی اچا ہے۔ بلکہ یہ تو اُن کا اپان تھا اس لئے جب فرقہ پرست ہندوؤں نے مولانا مظہر الحق صاحب کا بھی ہندو مسلم سوال کی آڑ لیکر، طرح طرح سے درود دھ کیا اور اُن کا اپان کیا، تب بھی اُن کے دل میں کوئی کرواہٹ نہیں آئی اور نہ اُن کو کچھ اور لیڈروں کی طرح اپنے خیالات بدلنے کی ہی ضرورت محسوس ہوئی۔ مولانا جلتے تھے کہ جن کی دوکانداری ہی فرقہ پرستی پر چلتی ہو، اُن سے اس کے سوا کسی دوسرے برتاؤ کی امید کی ہی نہیں جاسکتی۔

اسیوگ کے دنوں میں اور اس کے بعد مولانا بہت دنوں تک بارودیا پیٹھ کے چائسٹر رہے۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے 'مدر لیزڈ' م کا ایک ہفتہ وار اخبار بھی نکالا، جس میں ایک لیکچر نکالنے کے جرم میں اُن کو سزا بھی بھگتنی پڑی، کچھ دنوں بعد یہ اخبار بند دیا گیا۔ اس کے بعد وہ پھراڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمین بھی چنے گئے۔ ان دنوں ہی یعنی سنہ ۱۹۲۶ میں جب ہندستان کے دوسرے برے صوبوں کی طرح بہار کے ہندو مسلمانوں کے بیچ بھرتاتی وضع ہوئی، تو مظہر الحق صاحب نے پھرا میں ہی بہار کے سبھی ص خاص نیستاؤں کو اکٹھا کیا اور اُن سے آپس میں ایکٹا کے رکھنے کی اپیل کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہار میں اس

گرما گرمی اور جوش و خروش کے زمانے میں بھی ہندو مسلم ایکتا کا ایسا سند رکام ہوا کہ پورے دیش بھر میں اس کی چرچا رہی۔ اسی سال جب گواٹی میں آل انڈیا کانگریس کا اجلاس ہوا، تو بہت سے صوبوں نے اس اجلاس کی صدارت کے لئے مولانا منظر الحق صاحب کا نام پیش کیا۔ لیکن مولانا نے اس عہدے کو، جو ہندوستان میں سب سے بڑی عزت کی بات سمجھی جاتی رہی ہو، منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر انھوں نے کانگریس کی صدارت منظور کر لی، تو اپنے صوبے میں وہ ہندو مسلم ایکتا کے لئے جو کام کر رہے ہیں، وہ نہیں کر سکیں گے۔ اس بات سے بھی ثابت ہوتا ہو کہ مولانا ایکتا کے کام کو کتنی ترجیح دیتے تھے۔

اس طرح سے مولانا منظر الحق صاحب ایک ایسی ہستی تھے، جو فرقہ پرستی کے بڑے بڑے طوفانوں میں بھی شانت اور پریم کے گیت گاتے رہے۔ مسلمانوں نے انکو کافر کہا اور ہندوؤں نے ان پر طرح طرح کے الزام لگائے، لیکن وہ اپنی جگہ پر ہمیشہ جمے رہے۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں جب لاہور میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا، مولانا کا اپنے گاؤں فرید پور ضلع چھپرا میں انتقال ہو گیا۔ وہ بہت دن سے اپنے اس گاؤں میں آکر رہنے لگے تھے اور دن رات ایشور کی یاد اور مذہبی کتابوں میں ڈوبے رہ کر فقیروں جیسی زندگی بتا رہے تھے۔ یہیں انھوں نے آسم کا ایک بڑا باغ بھی لگایا تھا۔ انکے انتقال سے کچھ ہی دن پہلے انکے ایک جوان لڑکے کی موت بھی پاس کی ہی دوا، ندی میں ڈب جانے سے ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے وہ بڑے اداں رہنے لگے تھے۔

جیسا کہ راجپندر بابو نے لکھا ہے، سچ مچ مولانا کی موت سے ہندو مسلم ایکتا کا ایک سچا حامی اس دنیا سے چلا گیا۔ کاش مولانا آج ہوتے تو اس میں تو شک نہیں کہ زمانے کی حالت کو دیکھتے ہوئے انکو بڑا صدمہ پہنچتا، لیکن آج جو اسنے گئے آدھی دیش میں ایکتا قائم کرنے کا کام کر رہے ہیں، انکے لئے وہ ایک بڑے سہارے کی چیز بن جلتے اور سچی بات تو یہ ہے کہ آج اُن کا نام بھی نہیں ایک نئی روشنی اور نیا اُستادہ دینے کی طاقت رکھتا ہے۔



مولانا محمد میاں منصور انصاری

حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کی طرح مولانا محمد میاں صاحب منصور انصاری بھی ولی اللہی سنگٹھن کے اُس انمول سے تعلق رکھتے ہیں، جو ولی اللہی جماعت کے چھٹے امام شیخ الہند مولانا محمود احسن صاحب نے سال ۱۳۵۰ھ کی پچھلی بڑی لڑائی کے وقت شروع کیا تھا اور سرکاری کاغذوں و دولت کیٹی کی رپورٹ میں جس کو "سکن لیٹرس کانسپریسی" یعنی "ریشی خطوں کی سازش کے انوکھے اور رنگین نام سے پکارا گیا ہے۔ رولٹ کیٹی کی رپورٹ میں اس تحریک کا ہیرو مولانا محمد میاں صاحب کو ہی بتایا گیا ہے۔

مولانا محمد میاں صاحب اس پرانے انقلابی سنگٹھن سے اپنے بچپن میں ہی پرہیز ہو چکے تھے کیوں کہ اس سنگٹھن کے پانچویں امام مولانا محمد قاسم صاحب اُن کے سگے نانا تھے۔ مشہور ہے کہ جب مولانا محمد قاسم صاحب نے اپنی بیٹی یعنی مولانا محمد میاں صاحب کی ماں کی شادی کی تھی تب اُن کے پاس شادی میں خرچ کرنے اور دہیز میں دینے کے لئے ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ لیکن اس بات کا نہ تو اُن کو کچھ بھی رنج تھا اور نہ اس سے اُن کو کوئی دقت ہی محسوس ہوئی۔ دہیز کے دقت اُنھوں نے اپنی کچھ کتابیں اپنی پیاری بیٹی کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا تھا کہ میری دولت تو یہی ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ اگر تو اس کی

قد کرے گی، تو تجھے سچ مچ اس دولت سے ہی سچا سکھ اور آرام نصیب ہوگا۔ بیٹی نے بھی بنا کسی ہچک کے اس نایاب دولت کو لے کر آنکھوں سے لگا لیا۔

کہا جاسکتا ہے کہ اپنے مانا اور اپنی ماں کی یہی بھادونا ہیں مولانا محمد میاں صاحب کو بھی وراثت میں ملیں جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ دنیاوی لاپرواہی سے بچے رہے اور دیش بھگتی کی راہ میں آنے والی تمام مصیبتیں خوشی خوشی بھگتتے رہے۔

مولانا محمد میاں صاحب کے پتا مولانا عبداللہ انصاری علی گڑھ یونیورسٹی میں مذہبی تعلیم کے محکمے کے ناظم تھے اور اُس مشہور خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جس کا سلسلہ بادشاہ اورنگ زیب کے زمانے میں ہونے والے مشہور صوفی فقیہ شاہ ابوالمعالی سے ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس زمانے میں جب کہ چاروں طرف تنگ دلی کا دور دورہ تھا اور اسلام کو اس شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا، جس سے دوسرے مذہب کے لوگ اُس سے ڈرنے لگے تھے، تب شاہ ابوالمعالی نے اپنے اُپدیشوں میں پریم اور محبت کی دھارا بہا کر اسلام کی بہت بڑی سیوا کی تھی۔ اس طرح مولانا محمد میاں صاحب کو فرقہ وارانہ تنگ دلی کے خلاف لڑنے اور اُپسٹی پریم کا پرچار کرنے کے جذبات بھی خاندانی وراثت میں ملے تھے۔

اپنے ملک کی غلامی اور انگریزی راج کی بربریت سے بھی مولانا منصور اپنے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی واقف ہو چکے

تھے۔ ۱۵۵ء کی مشہور آزادی کی لڑائی میں اُن کے نانا مولانا قاسم صاحب نے کس طرح حصہ لیا تھا اور اُس کی وجہ سے اُن کو اور اُن کے خاندان کو کیسی کیسی تکلیفیں اٹھانی پڑی تھیں، سید حسن انفاری صاحب، جو ننھیال کے ناتے مولانا کے ایک قریبی بزرگ ہوتے تھے اور جن کی بادشاہ کے دربار میں بہت بڑی عزت تھی، کس طرح انگریزوں کی گولیوں سے شہید ہوئے تھے۔ اس کی کہانیاں مولانا کو بچپن سے ہی سننے کو ملی تھیں۔ اس کے بعد جب ہوش سنبھالا، تو آپ دیوبند مدرسے میں مولانا محمود احسن صاحب کے پاس پڑھنے کے لئے بیٹھ گئے۔ رہی سہی کمی اب یہاں پوری ہو گئی اور مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ نے ولی اللہی تحریک کے اصولوں اور اُس کے پچھلے اہم اس کو بھی پڑھا اور سمجھا۔ اس کے بعد آپ مولانا محمود احسن کی انقلابی کونسل کے ایک خاص ممبر بنائے گئے اور ملک کی آزادی کے کام میں پورے زور شور سے حصہ لینے لگے۔

۱۹۱ء میں جب یورپ میں لڑائی چھڑی اور مولانا محمود احسن صاحب، اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہندستان کی آزادی کی لڑائی میں دوسرے ملکوں کی مدد لینے کے د چار سے کٹے کے لئے چلے تو مولانا محمد میاں صاحب بھی اُن کے ساتھ تھے۔ یہ یا تو ابھی ایسی انوکھی تھی، جس میں پگ پگ پر غزندی کا یا کسی بھی اور مصیبت کے آجانے کا خطرہ تھا، پر دیش بھکتوں کا یہ دل کسی نہ کسی طرح ہندستان سے نکل ہی گیا۔

مکہ پہنچ کر مولانا محمود احسن صاحب نے حجاز کے گورنر غالب پاشا سے ملاقات کی اور ہندستان کی اتر پچیم کی سرحد پر بسنے والے آزاد قبیلوں کے نام ایک خط حاصل کیا جس کا ذکر رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں 'غالب نامہ' کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس خط میں آزاد قبیلوں کو بڑکی کی حکومت کی طرف سے یہ یقین دلایا گیا تھا، کہ اگر وہ ہندستان کی آزادی کی لڑائی میں مولانا محمود احسن صاحب کو مدد دیں گے، تو بڑکی کی سرکار اُن کی پوری مدد کرے گی۔ اس خط کو حاصل کرنے کے بعد مولانا محمود احسن صاحب اور اُن کے ساتھی مدینہ پہنچے، جس میں کہ وہ مدینہ کے گورنر بھری پاشا کی معرفت بڑکی کے بڑائی کے محکمے کے وزیر اوزر پاشا سے بھی ملاقات کر کے اُن سے بھی آزاد قبیلوں کے لئے اسی طرح کا خط حاصل کر لیں۔ لیکن مدینہ پہنچنے پر کچھ ایسی الجھنیں پیدا ہو گئیں، جس سے معلوم ہوا کہ ابھی انور پاشا سے ملاقات ہونے میں کافی دن لگ سکتے ہیں۔ دوسری طرف حالت یہ تھی کہ مولانا محمود احسن صاحب ہندستان چھوڑنے سے بہت پہلے ہی مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کو کابل روانہ کر چکے تھے، جو وہاں پر مولانا کے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔ اس لئے فیصلہ یہ کیا گیا کہ فی الحال غالب پاشا کے خط کو ہی کسی شخص کے ذریعے آزاد قبیلوں میں پہنچا دیا جائے اور پھر اس کے بعد وہی شخص کابل پہنچ کر اس تمام کام کی رپورٹ مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کو دے دے، جس سے وہ بھی اپنا کام شروع کر دیں۔

یہ فیصلہ تو کر لیا گیا، پر سوال یہ تھا کہ یہ کام سونپا کسے جائے؟ بہت دیر سوچنے و چارنے کے بعد آخر مولانا محمود احسن صاحب نے فیصلہ کیا کہ یہ کام صرف مولانا محمد میاں صاحب ہی پورا کر سکتے ہیں۔ انھوں نے مولانا محمد میاں صاحب سے یہ بات کہی۔ اور مولانا نے خوش خوشی اس کام کو پورا کرنے کا بار اپنے سر لے لیا۔ اس کام میں جو خطرے تھے۔ اُن سے محمد میاں صاحب بے خبر نہیں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ خاں ہمارے ہی قافلے میں کچھ انگریزوں کے خفیہ بھی چل رہے ہیں۔ جو ہندستان کا کنارہ پڑنے سے پہلے ہی یہ تمام باتیں ہندستان کی حکومت تک پہنچا دیں گے، پھر بھی انھوں نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور اُس خط کو لے کر ہندستان چل دیے۔

مولانا محمد میاں صاحب غالب نامہ کے ساتھ ہندستان آئے۔ انگریز حکومت کو بھی اس کی خبر لگ چکی تھی۔ اسلئے اُن کو پھنسانے کے لئے پورا جال بچھا لیا گیا تھا۔ پر مولانا نے ایسی ہوشیاری سے کام کیا کہ وہ تمام جال سمجھا کا بچھا رہ گیا اور مولانا پورے ہندستان کو پار کر کے سرحد کے آزاو قبیلوں میں جا پہنچے۔ اتنا ہی نہیں، وہ راستے میں غالب نامہ کی بہت سی کاپیاں بھی بانٹتے گئے۔ جس سے ملک کے لوگ بھی جان جائیں کہ ہندستان کی آزادی کے لئے اس طرح کی کوشش کی جا رہی ہے اور وہ بھی اُس موقع کے لئے ابھی سے تیاری شروع کر دیں۔

غالب نامہ لے کر مولانا محمد میاں صاحب حاجی فضل

واحد صاحب (حاجی تڑنگ زئی) کے پاس پہنچے۔ اُن کے سامنے اپنی پوری اسکیم رکھی۔ حاجی فضل واحد صاحب اس اسکیم کی بہت سی باتیں تو پہلے سے ہی جانتے تھے، کیوں کہ وہ ۱۹۰۹ء سے ہی دیوبند مدرسے اور مولانا محمود الحسن صاحب سے اپنا تعلقی قائم کر چکے تھے۔ اسی لئے اُنھوں نے انگریزوں کے ساتھ سرحد پر لڑائی بھی شروع کر دی تھی۔ 'غالب نامہ' پانے کے بعد حاجی فضل واحد صاحب نے اور بھی زور شور سے اپنی فوجوں کی بھرتی شروع کر دی اور اس میں اُن کو کامیابی بھی کافی ہوئی۔ مولانا محمد میاں صاحب نے بھی حاجی صاحب کے کام میں بہت بڑی مدد کی اور کئی لڑائیوں میں بھی حصہ لیا، لیکن اس کے بعد وہ کابل کے لئے چل دئے، کیوں کہ کابل کے شاہ امیر حبیب اللہ صاحب کے نام بھی اُن کے پاس کچھ خط تھے، جو اُن کو امیر تڑنگ پہنچانے تھے اور جن کے سہارے اُن کو اُمید تھی کہ کابل کی سرکار سے وہ کافی مدد حاصل کر لیں گے۔

مولانا محمد میاں صاحب نے کابل پہنچ کر امیر حبیب اللہ صاحب کے پاس وہ خط پہنچا دیئے۔ اور مولانا عبید اللہ صاحب کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے۔ مولانا عبید اللہ نے کچھ ہی دن بعد جب ہندوستان کی پہلی عارضی حکومت بنائی، تو مولانا محمد میاں صاحب نے اُس میں بہت بڑا حصہ لیا۔ یہ حکومت اس لئے بنائی گئی تھی جس سے اُس کے ذریعے ٹرکی، افغانستان اور جرمنی سے مدد لے کر ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف لڑائی شروع

کردی جائے۔ لیکن امیر حبیب اللہ نے اس کام میں کوئی مدد نہیں کی اس لئے یہ حکومت کوئی خاص کام نہیں کر سکی۔ مولانا محمد میاں صاحب کے دل کو اس سے اتنا دھکا لگا اور امیر حبیب اللہ کے وہ اتنے زیادہ خلاف ہو گئے کہ کابل کا جو سنگمٹھن امیر کو تخت سے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا اُس میں اُنھوں نے کھلے عام حصہ لینا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امیر اُن سے ناراض ہو گئے اور جب انگریزوں نے محمد میاں صاحب کو گرفتار کرنے کی اجازت امیر سے مانگی، تو امیر نے اُن کو فوراً اجازت دے دی لیکن امیر حبیب اللہ کے چھوٹے بھائی نصر اللہ خاں صاحب بھی، جو افغانستان کے سب سے بڑے وزیر تھے اور امیر کی انگریز پرستی سے تنگ آکر اُن کو گدڑی سے الگ کر دینا چاہتے تھے، مولانا محمد میاں صاحب کے حامی تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس حکم کی خبر جیسے ہی نصر اللہ خاں کو ملی اُنھوں نے اپنی موٹر کے ذریعے مولانا محمد میاں صاحب کو چپ چاپ افغانستان کے اُترے پہاڑوں میں پہنچا دیا اور انگریز لاکھ سرپکٹے پر بھی مولانا کو گرفتار نہ کر سکے۔

افغانستان کے اُترے پہاڑوں سے ۲۲ دن تک پیدل چل کر مولانا بخارا کی حد میں پہنچے اور ایک دن سرحدی پہرے داروں کی آنکھیں بجا کر چپ چاپ بخارا میں داخل ہو گئے اس کے کچھ ہی دن بعد امیر حبیب اللہ قتل کر دئے گئے اور امان اللہ خاں کابل کے تخت پر بیٹھے، تب مولانا محمد میاں صاحب کو کابل کی اس نئی حکومت نے کابل واپس

بلا لیا۔ مولانا خوشی خوشی کابل واپس آئے اور افغانستان کے راج کالج کو چلانے میں امیر امان اللہ خاں کی مدد کرنے لگے۔ لیکن اپنے دیش کی آزادی کو وہ نہیں بھول سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ہی دنوں میں امان اللہ خاں نے ہندستان پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ مولانا محمد میاں صاحب اور مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کی صلاح سے کیا گیا تھا اور سرحد کا وہ پورا سنگٹھن، جس کی کمان حاجی ترنگ زئی کے ہاتھ میں تھی، اس وقت بھی افغانستان کی پوری مدد کر رہا تھا، لیکن ہوائی جہاز وغیرہ نہ ہونے سے افغان فوجیں زیادہ آگے نہ بڑھ سکیں اور افغانستان اپنی مکمل آزادی منظور کرنا واپس لوٹ گیا۔ اس طرح مولانا کو ایک بار پھر مایوسی کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اس پر بھی وہ ہمت ہار کر بیٹھ نہیں گئے اور انھوں نے اپنے کام کو جاری رکھنے کا ہی فیصلہ کیا۔

افغانستان کی یہ لڑائی ختم ہونے کے بعد مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل چھوڑ کر چلا جانا پڑا۔ مولانا محمد میاں صاحب کے لئے یہ بھی ایک بہت بڑا صدمہ تھا کیوں کہ پچھلے دسول برسوں سے دونوں ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر دیش کی آزادی کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ مصیبتوں سے بھری ہوئی نہ جانے کتنی گھڑیاں دونوں نے ساتھ ساتھ بتائی تھیں اور جب کہ ناکامیابی اور ناشائے اُن کے دلوں پر چوٹ کی تھی تو انھوں نے ایک دوسرے کو تسلی دی تھی، لیکن آج، جب کہ اپنے ملک

لوہنے کے دروازے اُن کے لئے بند ہو چکے تھے۔ تب وہ قریب قریب ہمیشہ کے لئے ہی بچھڑ رہے تھے۔ پر دلش بھگت کی راہ میں گویا نہیں سہنا پڑتا۔ مولانا نے یہ بھی سہا اور ایک دن اپنے دل پر پتھر رکھ کر اپنے اس پیارے دوست کو وداع کر آئے۔

اس کے بعد مولانا محمد میاں صاحب انقویا میں افغان دوتاؤں کے ایک بڑے انسر بنا کر بھیجے گئے۔ وہیں آپ نے کافی دنوں تک کام کیا۔ لیکن ایک دن آپ اپنے کچھ اور ساتھیوں کے ساتھ روس کے جنگلوں میں گرفتار کر لئے گئے۔ وہاں آپ کو قریب تین مہینے تک تاش قند کے جیل خانے میں رہنا پڑا۔ اس کے بعد آپ کا مقصد یہاں جس میں آپ کو پھانسی کی سزا سنائی گئی، لیکن تاش قند کے ایک بڑے انسر سردار عبدالرسول پر آپ کی شخصیت کا اتنا اثر پڑا کہ اُس نے آپ کی رہائی کے لئے پوری طرح کوشش کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ رہا کر دیے گئے۔ اس طرح آپ ایک بار پھر پھانسی کے تختے پر چڑھتے چڑھتے بچے۔

تاش قند کی جیل سے رہا ہونے کے بعد آپ افغانستان واپس لوٹے۔ لیکن جلدی ہی ایک راجنٹک مشن پر افغان سرکار نے آپ کو روس بھیج دیا، جہاں آپ لینن و روس سے دوسرے بڑے بڑے لیڈروں سے ملے۔ اس کے بعد آپ انقورہ کے افغان دوتاؤں میں سب سے بڑے انسر بنا کر بھیجے گئے۔ اس زمانے میں سمرنا کی فتح پر انقورہ میں جو جلسہ ہوا تھا، اُس میں آپ نے افغانی سفیر (دوت) کی حیثیت سے تقریر کی تھی

جلا لیا۔ مولانا خوشی خوشی کابل واپس آئے اور افغانستان کے راج کالج کو چلانے میں امیر امان اللہ خاں کی مدد کرنے لگے۔ لیکن اپنے ویش کی آزادی کو وہ نہیں بھول سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ہی دنوں میں امان اللہ خاں نے ہندستان پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ مولانا محمد میاں صاحب اور مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کی صلاح سے کیا گیا تھا اور سرحد کا وہ پورا سنگٹھن جس کی کمان حاجی ترنگ زئی کے ہاتھ میں تھی، اس وقت بھی افغانستان کی پوری مدد کر رہا تھا، لیکن ہوائی جہاز وغیرہ نہ ہونے سے افغان فوجیں زیادہ آگے نہ بڑھ سکیں اور افغانستان اپنی مکمل آزادی منظور کرنا واپس لوٹ گیا۔ اس طرح مولانا کو ایک بار پھر مایوسی کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اس پر بھی وہ ہمت ہار کر بیٹھ نہیں گئے اور انھوں نے اپنے کام کو جاری رکھنے کا ہی فیصلہ کیا۔

افغانستان کی یہ لڑائی ختم ہونے کے بعد مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل چھوڑ کر چلا جانا پڑا۔ مولانا محمد میاں صاحب کے لئے یہ بھی ایک بہت بڑا صدمہ تھا کیوں کہ پچھلے دسیوں برسوں سے دونوں ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر ویش کی آزادی کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ مصیبتوں سے بھری ہوئی نہ جانے کتنی گھڑیاں دونوں نے ساتھ ساتھ بتائی تھیں اور جب کہ ناکامیابی اور نرا تباہی اُن کے دلوں پر چوٹ کی تھی تب انھوں نے ایک دوسرے کو تسلی دی تھی، لیکن آج، جب کہ اپنے ملک

لوہنے کے دروازے اُن کے لئے بند ہو چکے تھے۔ تب وہ قریب قریب ہمیشہ کے لئے ہی بچھڑ رہے تھے۔ پر دلش بھکتی کی راہ میں کیا نہیں سہنا پڑتا۔ مولانا نے یہ بھی سہا اور ایک دن اپنے دل پر پتھر رکھ کر اپنے اس پیارے دوست کو دوا دے کر آئے۔

اس کے بعد مولانا محمد میاں صاحب انقور میں افغان دوتاؤں کے ایک بڑے انسر بنا کر بھیجے گئے۔ وہیں آپ نے کافی دنوں تک کام کیا۔ لیکن ایک دن آپ اپنے کچھ اور ساتھیوں کے ساتھ روس کے جنگلوں میں گرفتار کر لئے گئے۔ وہاں آپ کو قریب تین مہینے تک ناش قند کے جیل خانے میں رہنا پڑا۔ اس کے بعد آپ کا مقدمہ ہوا جس میں آپ کو پھانسی کی سزا سنائی گئی، لیکن تاش قند کے ایک بڑے انسر سردار عبدالرسول پر آپ کی شخصیت کا اتنا اثر پڑا کہ اُس نے آپ کی رہائی کے لئے پوری طرح کوشش کی اور کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ رہا کر دئے گئے۔ اس طرح آپ ایک بار پھر پھانسی کے تختے پر چڑھتے چڑھتے بچے۔

تاش قند کی جیل سے رہا ہونے کے بعد آپ افغانستان واپس لوٹے۔ لیکن جلدی ہی ایک راجنٹک مشن پر افغان سرکار نے آپ کو روس بھیج دیا، جہاں آپ لینن و روس کے دوسرے بڑے بڑے لیڈروں سے ملے۔ اس کے بعد آپ انقورہ کے افغان دوتاؤں میں سب سے بڑے انسر بنا کر بھیجے گئے۔ اس زمانے میں سمرنا کی فتح پر انقورہ میں جو جلسہ ہوا تھا، اُس میں آپ نے افغانی سفیر (دوت) کی حیثیت سے تقریر کی تھی۔

اسی زمانے میں آپ کا ظلم گری بقر پاشا، جمال پاشا، رؤف بے اور علی ٹکری بے وغیرہ ترکی کے بڑے بڑے نیتاؤں کے سمپرک میں آئے اتفاق سے یہ سبھی نیتا اُس پارٹی کے تھے، جو مصطفیٰ کمال کے خلاف تھے، اس لئے مصطفیٰ کمال سے آپ کی کبھی نہیں نبھ سکی۔

انفورہ سے واپس آنے کے بعد آپ کچھ دنوں تک افغانستان کے سیاسی محکمے میں ایک بڑے امنر کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور پھر اُس کے بعد آپ کو ایجوکیشن کے محکمے میں ڈائریکٹر کا پوسٹ دیا گیا، جس پر آپ اُس زمانے تک رہے جب تک افغانستان کے تخت پر امان اللہ خاں رہے۔ لیکن اس کے بعد ہی افغانستان میں ایک طوفان اٹھا اور بچہ سقہ نے اپنی حکومت قائم کرنی۔ انگریزوں کی پالیسی کیا کیا کر سکتی ہے، اُس کا وہ ایک حیرت میں ڈال دینے والا نمونہ تھا جب کہ ایک معمولی ڈاکو کابل کے تخت پر بادشاہ کی حیثیت سے بیٹھ کر حکومت چمک رہا تھا۔ بچہ سقہ چاہتا تھا کہ اُسے کچھ ایسے لوگ مل جائیں، جن کا عام لوگوں پر اثر ہو اور جن میں راج کاج چلانے کی بھی قابلیت ہو۔ اس لئے اُس نے مولانا محمد میاں صاحب کو افغان پارلیمنٹ کا پریسیڈنٹ بنانا چاہا، لیکن محمد میاں صاحب جانتے تھے کہ بچہ سقہ کی کسی بھی طرح کی مدد کرنا انگریزوں کو درد دینا ہے۔ اس لئے انھوں نے پریسیڈنٹ بننا نامنظور کر دیا۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ یعنی مولانا گرفتار کر لئے گئے اور اُن کو پچاسی کا حکم سنا

